نومبر ۱۹۷۹ء

ماہنامہ

میثاق

لاہور

بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

وَقَدْ اَخَذَ مِيثَاقَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ

ماہنامہ

میثاق

لاہور

جلد ۲۸ | نومبر ۱۹۷۹ء | عدد ۱۱

مشمولات

صفحہ

- عرض احوال - - - - - - - - مرتب
- تکمیل رسالت اور اس کے لوازم - - - - ڈاکٹر اسرار احمد
- حج اور عیدالاضحیٰ اور ان کی اصل روح ، قرآن حکیم کے آئینے میں - - - ڈاکٹر اسرار احمد
- سیرۃ نبوی قرآن کریم کی روشنی میں - - مولانا وصی مظہر ندوی
- روزہ اور اس کے آداب - - - - - محمد یونس جنجوعہ

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

یکے از مطبوعات

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت : ۳۶ - کے ، ماڈل ٹاؤن ، لاہور
(فون : 852683 - 852611)

مُرتّب

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

عرضِ احوال

مدیر 'میثاق' ابھی تک تبلیغی دورے کے سلسلے میں ملک سے باہر ہیں۔ وہ شاید اوائل نومبر میں وطن واپس لوٹیں۔ زیرِ نظر شمارہ بھی ان کی عدم موجودگی کے باوجود شائع کیا جا رہا ہے۔ تاکہ قارئین یہ محسوس کر سکیں کہ ہمیں 'میثاق' کی بروقت، اور باقاعدہ اشاعت کا کس قدر اہتمام ہے۔ اگر کبھی تاخیر ہوئی ہے یا ہو جاتی ہے تو صرف ناگزیر موانع کی وجہ سے ہوتی ہے، ہمارے تساہل کی وجہ سے نہیں۔

جیسا کہ ہم نے وعدہ کیا تھا سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ڈاکٹر صاحب کے سلسلۂ تقاریر کی دوسری تقریر بعنوان 'تکمیلِ رسالت اور اس کے لوازم' اس اشاعت میں دی جا رہی ہے۔ یہ تقریر اس لحاظ سے بڑی اہم ہے کہ اس میں بعض مغربی اہلِ قلم کی ان تصنیفات کو زیرِ بحث لایا گیا ہے جو انہوں نے حضورؐ کی زندگی پر سپردِ قلم کی ہیں۔

ان مغربی مفکرین میں سے کچھ تو وہ ہیں جو: قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِیْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ کے مصداق ہیں۔ صدیاں گذر جانے کے باوجود ان کے سینے کی آگ بجھ نہ سکی۔ ایک نہایت ہی قلیل عرصے میں اسلام کی ہمہ گیر اشاعت اور پھر ہمیشہ کے لئے اس کا ایسا جماؤ، جسے ان کا برسوں کا سیاسی تسلّط بھی نہ ہلا سکا، ان کے دل کا روگ بن گیا۔ وہ ٹھنڈے دل سے سوچ ہی نہ سکے کہ محمدؐ عربی (صلی اللہ علیہ وسلم) اور اس کے لائے ہوئے دین میں آخر وہ کون سی ایسی مقناطیسی کشش تھی کہ صحرائے عرب کے چشمۂ آبِ حیواں سے پھوٹنے والی ایک لہر سیلِ بے پناہ بن کر ساری دُنیا پر چھا گئی۔ اِس دوران میں ایسا تو اکثر ہوا ہے اور ہو رہا ہے کہ ہزاروں تشنگانِ مغرب اپنی پیاس بجھانے کے لئے اس چشمۂ شیریں کے گرد جمع ہو گئے، مگر ایسا برضا و رغبت کبھی نہ ہو سکا کہ اس شاہدِ حجازی کے حسنِ جہانگیر سے ہٹا کر

کسی نے اس قتالۂ مغرب پر نگاہِ غلط انداز بھی ڈالی ہو جس کا چہرہ تو بے شک روشن ہے مگر جس کا اندروں چنگیز سے بھی تاریک تر ہے۔ ایسے متعصّب مصنّفین کا تو مشغلہ ہی یہ ہے کہ اسلام اور ہادیٔ اسلام کے خلاف دل کے جلے پھپھولے پھوڑتے رہیں، اور زہر میں بجھے تیر چلاتے رہیں۔

لیکن ان میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جنھوں نے ہادیٔ اسلام صلّی اللہ علیہ وسلّم کو بھرپور خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ ان میں مانٹگمری واٹ MONT GOMERY- WATT اور ٹوائن بی TWYN BI سب سے زیادہ ممتاز ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے بتایا ہے کہ اگرچہ ان لوگوں کا خراجِ عقیدت واقعی : الفضل ما شھدت بہ الاعداء کی ذیل میں آتا ہے اور کسی حد تک ان کے غیر متعصّب اور غیر جانبدار ہونے کا ثبوت ہے تاہم ان کا یہ خراجِ عقیدت دراصل نبوّت کے ایک محدود تصوّر پر مبنی ہے جو ان کے ہاں نسلاً بعد نسلٍ متوارث چلا آتا ہے، وہ خدا اور قیصر، دین اور دُنیا کی دوئی کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک نبوّت کا مطلب صرف فقر و درویشی، زہد و قناعت، تزکیہ و ارشاد اور وعظ و تبلیغ ہے۔ باقی رہا اصلاحِ معاش، ملکی اُمور کا انتظام و انصرام، جنگ و صلح تو یہ دُنیاداری کے کام ہیں، جن سے نبوّت کو کوئی سروکار نہیں۔ اس لئے ان کے تجزیہ کے مطابق آپ مکّہ میں بحیثیت نبی (خاکم بدہن) ناکام رہے۔ البتہ سیاستدان کی حیثیت سے جس کا تعلق آپ کی مدنی زندگی سے ہے، آپ بہت کامیاب رہے۔ پہلا گروہ اگر نادان دشمنوں کا تھا تو یہ دوسرا دانا دوستوں کا ہے۔ اس لئے ان نام نہاد انصاف پسند ناقدین کے اس غلط اندازِ فکر سے متنبّہ رہنا چاہیئے، کیونکہ ہمارا دین صرف پوجا پاٹ پر مبنی چند رسومات کا نام نہیں بلکہ وہ ایک مکمّل نظامِ حیات ہے جو زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے معاملات سے لے کر بین الاقوامی معاملات تک پر حاوی ہے۔ اسی کو بپا کرنے کے لئے رسولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم مبعوث ہوئے۔ اس کے لئے پہلے آپ نے مکّہ میں کام کیا اور پھر مدینہ میں، اور جب ایک معتدبہ قوّت پیدا کر لی تو جاہلی نظام کو بیخ و بُن سے اکھاڑنے اور دینِ اللہ کو نافذ کرنے کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے، اور سرزمینِ عرب کی حد تک اس کو قائم و نافذ کرنے کے بعد اس کو مرکز (BASE) بنا کر دنیا کے دوسرے خطّوں

میں اس کے نفاذ کی طرح ڈال دی۔ اسی ضمن میں ڈاکٹر صاحب نے دین اور مذہب کی ہر دو اصطلاحات کا فرق بھی واضح کیا ہے اور بتایا ہے کہ کس طرح مذہب ایک محدود تصوّر ہے، جبکہ دین پوری زندگی پر محیط ایک مخصوص نظام کا نام ہے، مگر صدیوں کے غیر ملکی سیاسی و فکری تسلّط نے اسلام کو خود اہلِ اسلام کی نظروں میں مذہب بنا کر بڑا محدود کر دیا اور یہ غلط اندازِ فکر اس قدر ہمہ گیر اور وسیع ہو گیا کہ اقبالؔ کو شکوہ کرنا پڑا کہ ؎

ملّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت ❊ ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

'میثاق'، ایسے وقت میں قارئین کے ہاتھوں میں پہنچ رہا ہے جب کہ وہ فریضۂ قربانی اور حج بیت اللہ ادا کرنے والے ہوں گے، یا ان کی ادائیگی کی سعادت ابھی ابھی حاصل کی ہوگی۔ ضروری ہے کہ وہ اس رُوح اور جذبہ سے بھی پوری تفصیل کے ساتھ آگاہ ہوں جس کو زندہ رکھنے کے لئے اسلام کے ان دو ارکان کو شعائر اللہ کا درجہ حاصل ہوا اور جس وجہ سے اللہ تعالیٰ اپنے ایک مسلم حنیف ابراہیم علیہ السّلام کی اس سنّت کو زندہ جاوید بنا دیا انہوں نے بتایا ہے کہ اللہ نے اپنی خلّت اور امامت النّاس کا تاج اپنے سر پر اس وقت رکھا جب اس نے خوب آزما کر دیکھ لیا کہ ابراہیمؑ کا دل اس کی محبّت کے سوا ہر جذبہ سے خالی ہے، وہ اس کی خاطر نہ صرف اپنے والدین، اپنا گھر بار، اپنا وطن چھوڑنے کے لئے تیار ہے بلکہ آگ میں کود جانے اور اس سے بھی بڑھ کر اپنے لختِ جگر کے گلے پر اپنے ہاتھ سے چھری چلانے کے لئے بھی بغیر کسی پس و پیش کے آمادہ ہے۔ اپنے مینڈھے کے گلے پر چھری چلانے سے پہلے ہمیں اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھنا چاہیئے کہ کیا تسلیم و رضا اور اطاعت و وفا شعاری کا وہ جذبہ ہمارے سینوں میں بھی موجود ہے جو ابراہیمؑ کے سینے میں موجزن تھا اور خدا کے گھر کا طواف کرتے ہوئے ہمیں اپنے دلوں کو ٹٹول کر جائزہ لینا چاہیئے کہ کیا ان میں بھی ربّ العالمین کے لئے وہی شیفتگی و وارفتگی پائی جاتی ہے، جس سے ابراہیم کا سینہ سرشار تھا۔

مولانا وصی مظہر ندوی نے اپنے خطابات میں، جو انہوں نے مختلف حلقوں میں فرمائے، اور جو اس اشاعت میں دیئے جا رہے ہیں، حضور صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر، قرآن کی روشنی میں گفتگو کی ہے۔ پہلی وحی کے بعد عارضی طور پر کچھ عرصہ کے لئے انقطاعِ وحی — فترۃ الوحی — سے انہوں نے قرآن کے کلامِ الٰہی ہونے پر بالکل بجا طور پر استدلال کیا ہے۔ کیونکہ اگر یہ حضورؐ کا اپنا کلام ہوتا جیسا کہ

ڈاکٹر اسرار احمد

تکمیلِ رسالت اور اُسکے لوازم

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝
ھُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ
کُلِّہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْمُشْرِکُوْنَ ۝ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ھَلْ اَدُلُّکُمْ عَلٰی تِجَارَۃٍ تُنْجِیْکُمْ
مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ ۝ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَتُجَاھِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ بِاَمْوَالِکُمْ
وَاَنْفُسِکُمْ ذٰلِکُمْ خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ یَغْفِرْ لَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ وَیُدْخِلْکُمْ
جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ وَمَسٰکِنَ طَیِّبَۃً فِیْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ذٰلِکَ الْفَوْزُ
الْعَظِیْمُ وَاُخْرٰی تُحِبُّوْنَھَا نَصْرٌ مِّنَ اللّٰہِ وَفَتْحٌ قَرِیْبٌ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ ۝
یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰہِ کَمَا قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ لِلْحَوَارِیّٖنَ
مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ ط قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ فَاٰمَنَتْ طَّآئِفَۃٌ
مِّنْ بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ وَکَفَرَتْ طَّآئِفَۃٌ ج فَاَیَّدْنَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلٰی عَدُوِّھِمْ
فَاَصْبَحُوْا ظٰھِرِیْنَ ۝ ــــــ صَدَقَ اللّٰہُ الْعَظِیْمُ ۝

رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ وَیَسِّرْ لِیْٓ اَمْرِیْ وَاحْلُلْ عُقْدَۃً مِّنْ لِّسَانِیْ
یَفْقَھُوْا قَوْلِیْ ــــــ

آپ کو معلوم ہے کہ آج سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم اور تاریخ اسلام کے موضوع پر سلسلۂ تقاریر کے ضمن میں دوسری تقریر ہے۔

کل ہم نے منصبِ رسالت اور اس کا مقصد سمجھنے کی کوشش کی تھی اور آج ختمِ نبوت اور اس کے لوازم پر غور کرنا ہے۔ کل جو کچھ عرض کیا جا چکا ہے اس کا خلاصہ ذہن میں مستحضر کر لیجئے ــــــ سب سے پہلی بات جو میں نے عرض

کی تھی، یہ تھی کہ ایمان جس کی بنیاد پر اسلام کا پورا قصر تعمیر ہوتا ہے، اُس کا حاصل کہہ لیں، نتیجہ کہہ لیں، اس کا لُبّ لُباب کہہ لیں، وہ یہ ہے کہ انسانی زندگی اصل میں تو وہ ہے جو موت کے بعد شروع ہوگی۔ یہ زندگی جسے دُنیوی زندگی کہنا چاہیے اُس اصل کتابِ زندگی کے صرف دیباچے اور مقدّمے کی حیثیت رکھتی ہے اور اس کی اصل حیثیت ایک امتحانی وقفے کی ہے۔ اس امتحان کے نتیجے کا اعلان ہوگا یوم آخر کو اور پھر اس نتیجے کا ظہور پوری ابدی زندگی میں جاری رہے گا ÷

دوسری بات یہ عرض کی گئی تھی کہ اس محاسبۂ اُخروی کی اوّلین اساس وہ استعداداتِ فطری ہیں جو انسان میں ودیعت کی گئی ہیں، جن سے مسلّح کر کے انسان کو اس دنیا میں بھیجا گیا اور وہ ہیں سماعت، بصارت، عقل و شعور اور نیکی و بدی کی تمیز۔ یہ تو بنیادی استعدادات ہیں جن سے مسلّح ہو کر انسان اس دار الامتحان میں وارد ہوا۔ اس سے آگے بڑھئے تو آئینۂ قلب ہے جو آئینۂ جہاں نما ہے، اس میں معرفتِ ربّانی بھی موجود ہے، محبّتِ خداوندی کی آگ بھی سینے میں سلگتی رہتی ہے۔ انسان میں وہ روحِ ربّانی بھی ہے جس کی وجہ سے اس کا رجحان عالمِ علوی یا عالمِ ملکوت کی طرف رہتا ہے۔ مغربی مفکّرین نے بھی انسانی شخصیت کے اس پہلو کا مشاہدہ کیا اور اسے DIVINE SPARK سے تعبیر کیا جسے ہم شعلۂ ملکوتی کا نام دے سکتے ہیں، اقبالؔ کہتا ہے ؎

ہے ذوقِ تجلّی بھی اِسی خاک میں پنہاں   غافل! تو نِرا صاحبِ اِدراک نہیں ہے

انسان کو صرف حواسِ خمسہ دے کر نہیں بھیجا گیا۔ اور بھی بہت سی استعدادات ہیں جو اس میں ودلیعت کی گئیں۔ ان کی بنیاد پر انسان اس امتحان میں مبتلا کیا گیا۔ وہ مسئول ہے، جواب دہ ہے، ACCAUNTABLE ہے، مکلّف ہے، جواب دہ ہے — اور RESPONSIBLE ہے۔ مجھے خوشی ہوئی کہ کل کی تقریر کے بعد ایک نوجوان نے مجھ سے یہ کہا کہ یہ مسئلہ آج پہلی مرتبہ سمجھ میں آیا ہے کہ جن لوگوں تک دعوتِ نبوّت نہیں پہنچی وہ بھی مسئول ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ اُن کی مسئولیت کا درجہ ذرا کمتر رہے گا اور جن تک دعوتِ نبوّت و رسالت پہنچ جائے اُن پر چونکہ اتمامِ حجّت ہو جاتا ہے، لہٰذا ان کی مسئولیت بڑھ جاتی ہے، مگر مسئول ہر انسان ہے ÷

تیسری بات جو کل عرض کی گئی، یہ تھی کہ نبوّت و رسالت کا سلسلہ رحمتِ خداوندی کا مظہر ہے۔ انسان اگرچہ مسئول اپنی ان فطری استعدادات کی بنیاد پر ہے، لیکن رحمتِ خداوندی نے نبوّت و رسالت، وحی اور انزال کتب کا سلسلہ انسان کی ان فطری استعدادات کو تقویت پہنچانے کے لئے جاری کیا۔ اس کے قلب میں نورِ معرفت ہے لیکن دھندلا جاتا ہے۔ اس پر غبار آجاتا ہے اور آئینہ مکدّر ہو جاتا ہے، نورِ وحی اس کو اجاگر کرتا ہے۔ رحمتِ خداوندی متقاضی ہوئی کہ انسان کے آئینۂ قلب کو منوّر کرنے کے لئے یہ نور اُس پر اتارا جائے۔ تخلیق کے متعلّق ایک بڑا پیارا شعر ہے ؎

من نہ کردم خلق تا سُودے کنم ❊ بلکہ تا بر بندگاں جودے کنم

سلسلۂ خلق بھی رحمتِ خداوندی کا مظہر ہے۔ اس پر مزید اللہ کی رحمت، نبوّت و رسالت، انزالِ وحی اور بعثتِ انبیاء کی شکل میں ہوئی تاکہ ان استعدادِ فطری کو تقویت حاصل ہو۔ اس کا حاصل یہ کل سورۂ نساء کی اس آیت کی روشنی میں عرض کر چکا ہوں: رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ ۢ بَعْدَ الرُّسُلِ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا - رسولوں کو مُبشّر اور نذیر بنا کر بھیجا گیا تاکہ انسان کے پاس خدا کے مقابلے میں کوئی محبّت، کوئی عُذر، کوئی بہانہ، کوئی دلیل باقی نہ رہ جائے۔ اسے قطعِ حُجّت سے بھی تعبیر کر لیجئے، اتمامِ حجّت سے بھی تعبیر کر لیجئے۔ اللہ کی محبّتِ اُولیٰ تو انسان پر قائم ہے کہ سمع و بصر سے تمہیں نوازا، عقل و شعور سے تمہیں مسلّح کیا، نیکی اور بدی کی تمیز تمہارے اندر ودیعت کی، اپنی معرفت کا ایک دِیا تمہارے قلب میں روشن کیا، اپنی محبت کی ایک سلگتی ہوئی آگ تمہاری روح کے اندر رکھی۔ یہ سب کچھ وہ ہے جس پر محبّتِ اُولیٰ کی بنیاد ہے اور اس محبّت کا اتمام ہو جاتا ہے، اِس نورِ وحی کے بعد، بعثتِ انبیاء کے بعد، ارسالِ رُسُل کے بعد، انزالِ کتب کے بعد اب کسی کے پاس اپنی غلط روی کے لئے کوئی عذر موجود نہیں۔ چنانچہ انبیاء و رسل اُمتوں کے محاسبے کے وقت قیامت کے دن عدالتِ اُخروی میں سرکاری گواہوں کی حیثیت سے پیش ہوں گے۔ وہ TESTIFY کریں گے، گواہی دیں گے کہ اے اللہ! تیری ہدایت جو ہم تک پہنچی ہم نے بلاکم کاست ان تک پہنچا دی: فَكَيْفَ

اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ؕ (وہ دن کیسا ہوگا جب ہم ہر امّت پہ ایک گواہ کھڑا کریں گے اور اے نبی! آپ کو گواہ بنا کر لائیں گے ان کے خلاف!) - اس کے دو نتیجے نکلتے ہیں: ایک تو مَیں نے کل عرض کیا تھا کہ رسولوں کی آمد کے بعد نہ صرف یہ کہ آخرت میں کوئی عذر نہیں رہے گا انسان کے پاس اس دُنیا میں بھی جس قوم کی طرف رسول کو بھیج دیا جاتا ہے، اس کو پھر کوئی رعایت نہیں دی جاتی، اس کا فیصلہ چکا دیا جاتا ہے، اِس لئے کہ رسولوں کی آمد کے بعد بھی وہ اپنی کجروی پہ مصر رہی، اپنی غلط روی پر اڑی رہی، اپنے کفر اور شرک کے اوپر قائم رہی تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اب اس میں خیر کا کوئی پہلو باقی نہیں رہا۔ اب یہ خس و خاشاک کی مانند ہے، اس کی پیٹھ کا بوجھ ہے جس سے اس زمین کو نجات دلا دینے ہی میں عافیت ہے - چنانچہ رسولوں کے بعد اگر قوم اعراض و انکار پہ اڑی رہتی ہے تو عذابِ استیصال آتا رہا ہے، وہ عذاب کہ جس سے وہ قوم نیست و نابود کر دی گئی - قومِ نوح، قومِ ہود، قومِ صالح، قومِ شعیب، قومِ لوط اور آلِ فرعون، جن کا ذکر قرآن مجید میں بار بار آیا ہے، سب نیست و نابود کر دی گئیں۔ اس کا ایک اور نتیجہ بھی ہے، اس کو بھی ذہن نشین کر لیجئے۔ چونکہ بعثتِ رسول سے مقصد ہے اتمامِ حجت، لہٰذا رسولوں کے باب میں سنّت یہ قرار پائی کہ ہر قوم میں اُسی میں سے کسی کو رسول بنا کر کھڑا کیا جائے تاکہ کوئی اجنبیت کا پردہ حائل نہ رہے، کوئی مغائرت کا حجاب درمیان میں نہ ہو۔ اس بنا پر انسانوں کے پاس انسان ہی رسول بنا کر بھیجے گئے اور اکثر و بیشتر اسی قوم کے افراد کو بھیجا گیا: وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا + وَاِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا + وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ......

استثناءات کوئی ہوں گی، لیکن قانون یہی ہے کہ اس قوم کا کوئی فرد ہو، اس کی زندگی اُن کی نگاہوں کے سامنے گزر رہی ہو، اس کی سیرت و کردار، اس کی امانت و صداقت کے وہ خود گواہ ہوں، اُن ہی کی زبان بولتا ہوا آئے - کسی نوع کا کوئی حجاب، کوئی مغائرت، کسی نوع کا کوئی پردہ حائل نہ رہے۔ گویا کہ اتمامِ حجت بتمام و کمال ہو جائے۔ یہ ہے مختصراً میری کل کی گفتگو کا حاصل اور بعثتِ رسل سے اصل مقصود جیسا کہ مَیں نے عرض کیا تھا، ہماری تاریخ - تاریخِ اسلام کا دراصل آغاز ہوتا ہے حضرت

آدم علیہ السّلام سے۔ وہ پہلے انسان بھی ہیں اور پہلے نبی بھی۔ تاریخِ انسانیّت اور تاریخ نبوّت بالکل متوازی ہیں۔ قافلۂ انسانیت بھی ارتقائی منازل طے کرتا رہا اور نبوّت نے بھی ارتقائی منازل طے کئے۔ کل میں عرض کر چکا ہوں، کہیں مغالطہ نہ ہو جہاں تک نبی کے اپنے ذاتی شعور کا تعلق ہے وہ وہبی ہوتا ہے، اکتسابی نہیں ہوتا، حضرت آدمؑ کا شعور مکمل تھا لیکن بحیثیتِ مجموعی نسلِ آدم نے ارتقائی مراحل طے کئے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس پر عہدِ طفولیت بھی آیا ہے، عقل و شعور کی پختگی کا دور بھی آیا ہے اور اس کی نسبت سے وحی بھی نازل ہوتی رہی ہے، کتابیں اترتی رہی ہیں، شرائع میں فرق ہوتا رہا ہے، تفصیلی احکام بدلتے رہے ہیں۔ ایک طرف قافلۂ انسانیت ارتقائی مراحل طے کر رہا ہے اور ساتھ ساتھ قافلۂ نبوّت بھی ارتقائی مراحل سے گذر رہا ہے۔ تا آنکہ محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم پر نبوّت اپنے کمال کو پہنچ گئی۔ رسالت اپنے تکمیلی مرحلے تک پہنچ گئی۔ نتیجۃً نبوّت ختم ہو گئی۔ کل بھی میں نے عرض کیا تھا کہ محض ختمِ نبوّت کو سامنے نہ رکھیے، جو صحیح ہے، اپنی جگہ اٹل ہے مگر اس کا اہم تر پہلو اتمامِ نبوّت اور تکمیلِ رسالت ہے جو حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم پر ہوئی ؎

اب آج سب سے پہلے تو میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس اتمامِ نبوّت اور تکمیلِ رسالت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے سیرتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسّلام کے فہم میں اپنوں نے بھی ٹھوکریں کھائی ہیں اور دوسروں نے بھی بڑی زبردست غلطیاں کی ہیں، میں دوسروں کا ذکر پہلے کر رہا ہوں۔ TWYN BI اس دور کے فلسفۂ تاریخ کا بہرحال ایک مسلّمہ مرتبے کا حامل شخص ہے، اس کا ایک جملہ ہے اور یہ ایک جملہ ایک پوری ذہنیت کی عکّاسی کرتا ہے :

MOHAMMAD FAILED AS A PROPHET BUT HE SUCCEEDED AS A *STATESMAN.

تنقید کا اصول یہ ہے کہ وہ ہمدردانہ ہونی چاہیئے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جس شخص کی بات پر آپ تنقید کر رہے ہوں، پہلے ہمدردی کے ساتھ اس کی بات سمجھنے کی کوشش کیجئے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ پھر جو نقد و جرح آپ کو کرنی ہو، کیجئے۔ تو ذرا ہمدردانہ

طور پر سمجھئے کہ اس نے کیا کہا ہے، کہنا کیا چاہا ہے، اس کے ذہن کی اصل الجھن کیا ہے۔ ان کا جو تصوّرِ نبوّت ہے وہ کیا ہے۔ وہ عیسائی ہے اور چاہے انسان کتنا ہی ملحد ہو جائے، مذہبی روایات اس کا ساتھ نہیں چھوڑا کرتیں۔ وہ انسان کے فکر کے اندر رچی بسی ہوتی ہیں۔ بہرحال وہ عیسائی ہے، تورات پڑھی ہے، انجیل پڑھی ہے۔ نبوّت کا ایک تصوّر ان کے ذہن میں بنا ہے۔ اس تصوّرِ نبوّت میں نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی سیرتِ مطہّرہ سما نہیں رہی، وہ اتنا چھوٹا سانچہ ہے اس لئے کہ وہ نبوّت کا سانچہ ہے، ختمِ نبوّت کا نہیں ہے، اتمامِ نبوّت کا نہیں ہے، تکمیلِ رسالت کا نہیں ہے۔ وہ اس سے تولنا چاہ رہے ہیں محمد عربی صلّی اللہ علیہ وسلّم کو کہ جس سے حضورؐ کو تولا نہیں جا سکتا۔ لہٰذا وہ اپنے فہم کے مطابق دیکھتے ہیں کہ حضورؐ کی مکّی زندگی ان کے نبوّت کے سانچے میں فِٹ بیٹھتی ہے۔ کیونکہ دعوت ہے، تبلیغ ہے، وعظ ہے، نصیحت ہے، کچھ حواریّین ہیں صحابہؓ ہیں، ان کی تربیت ہے۔ حضرت مسیحؑ کوہِ زیتون پر وعظ فرما رہے ہیں اور نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کوہِ صفا پر وعظ فرما رہے ہیں، مطابقت نظر آئی۔ حضرت مسیحؑ کے ساتھ چلتے پھرتے حواری ہیں۔ شام یہاں، صبح وہاں — یہاں یہ ہے کہ بیت ارقم ہے، ایک مرکز ہے، تربیت ہے، تعلیم ہے۔ اگر حضرت مسیح کو ستایا جا رہا ہے، تو یہاں حضورؐ کو بھی ستایا جا رہا ہے۔ وہ بھی اپنے ستانے والوں کو دعائیں دے رہے ہیں۔ یہاں تک تو بات سمجھ میں آتی ہے، اس کے بعد جو مدنی دَور ہے وہ ان کے کسی سانچے میں فِٹ نہیں بیٹھتا۔

اب ان کا جو نقشہ انبیاءؑ کا ہے وہ ذہن میں رکھئے۔ عیسائیوں کیلئے نبوّت کا آئیڈیل حضرت یحییٰؑ ہیں۔ یہ مَیں نے اس لئے کہا کہ حضرت مسیح ان کے نزدیک نبی سے برتر کچھ اور شئے ہیں۔ اگرچہ عیسائیوں میں بھی، آپ کو معلوم ہونا چاہیے، موحدین رہے ہیں جو تثلیث کے قائل نہیں ہیں۔ اب بھی JEHOV-A'S WITNESSES نام سے کچھ لوگ ہیں جو کبھی کبھی ادھر ادھر گھومتے نظر آتے ہیں، وہ تثلیث کے قائل نہیں ہیں، حضرت مسیحؑ کو صرف رسول مانتے ہیں۔ ہمارے اور ان کے مابین فرق صرف یہ رہ گیا ہے کہ وہ محمدٌ رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں مانتے، تثلیث کے وہ قائل نہیں۔ تو ان میں سے عام لوگوں کے اعتبار سے حضرت یحییٰ علیہ السّلام اور ان موحّدین عیسائیت کے اعتبار سے حضرت عیسیٰ علیہ السّلام نبوّت کا کامل نمونہ ہیں اور ان دونوں کی زندگی میں حضورؐ کی مدنی زندگی کی کوئی جھلک انہیں نظر نہیں آتی۔ انہیں مکّی دَور تو اس کے مطابق نظر آتا ہے اور یہاں ان کے قول کے مطابق، آپؐ ناکام ہو گئے اور مکّہ سے نکلنا پڑا۔ چنانچہ اس نے لکھ دیا کہ :

MOHAMMAD FAILED AS A PROPHET.

لیکن حضورؐ کے مدینے میں آنے کے بعد انہیں یہ نظر آتا ہے کہ یہ بالکل ایک دوسری شان ہے۔ اب ایک STATESMAN ہے، ایک مدبّر ہے، ایک سیاست دان ہے، ایک سپہ سالار ہے۔ یہ حیثیتیں ہیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو نمایاں ہو کر آ رہی ہیں۔ لہٰذا اس اعتبار سے وہ کہتے ہیں کہ وہ کامیاب ہو گئے۔ یہ ایک جملہ دیکھئے TYNEBI کا اور پھر آپ پروفیسر MONTGOMERY WATT کی سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر کتاب دو جلدوں (VOLUMES) میں دیکھئے :

(۲) ——— (۱)

MOHAMMAD AT MADINA اور MOHAMMAD AT MECCA.

یہ دونوں علیٰحدہ علیٰحدہ VOLUMES ہیں۔ (ہمارے ہاں اس مصنّف کو سرکاری سطح پر منائی جانے والی کانفرنس میں بلایا گیا تھا) اور ذہن میں رکھئے کہ ان کے ذہن میں وہی تخصیص ہے۔ ایک محمدؐ نہیں ہے، دو محمدؐ ہیں (صلی اللہ علیہ وسلم) یا یوں کہہ لیجئے نعوذ باللہ من ذٰلک، یہ ایک انسان کے دو چہرے ہیں، دو رُوپ ہیں اور ان کا CONTRAST نمایاں کرنے کے لئے جدا جدا VOLAMES میں لایا جا رہا ہے۔ ہمارے کچھ نیک دل اور سادہ لوح لوگ ان تعریفوں پر خوش ہو جاتے ہیں جو اُس نے حضورؐ کے تدبّر، دُور اندیشی اور معاملہ فہمی پر کیں۔ حالانکہ اس میں زہر چھپا ہوا ہے، اور وہ یہ ہے کہ محمدؐ اگر قابلِ تعریف ہیں تو بحیثیت مُدبّر ہیں، بحیثیت سیاست دان ہیں، بحیثیت سپہ سالار ہیں،

بحیثیت ایک دُور اندیش انسان، اور بحیثیت ایک معاملہ فہم انسان ہیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف بحیثیت رسول نہیں ہے۔ یہ اصل میں وہ زہر ہے جو اس میں پنہاں ہے۔ بہرحال یہ تو وہ ٹھوکریں ہیں جو اوروں نے کھائیں، کچھ جان بوجھ کر بھی کھائیں، کچھ تعصب کے پردے بھی حائل رہے ہمارے ہاں تصویر کا ایک بالکل دوسرا رخ نظر آئے گا۔ ہمارا سارا مطالعہ سیرت؛ اکثر و بیشتر ساری تقاریر سیرت، محفل میلاد کے سارے بیانات، سب کا حاصل یہ ہے کہ ایک بالکل (SUPER NATURAL) یا مافوق البشر ہستی کا تصور ہے جو سامنے آتا ہے۔ HUMAN LEVEL یا انسانی سطح پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سمجھنے اور ان کے اصل کارنامے کی عظمت کو جانچنے کی ہمارے ہاں کوئی کوشش نہیں ہوئی۔ جو لوگ ہمارے اس مرتبہ کی ایک روزہ سیرت کانفرنس میں شریک ہوئے، انہیں یاد ہوگا کہ مفتی محمد حسین صاحب نعیمی نے ایک بہت عمدہ جملہ کہا اور اسے میں خاص طور پر اس لئے QUOTE کر رہا ہوں کہ وہ اس مکتبۂ فکر سے تعلق رکھتے ہیں جسے عام طور پر بریلوی مکتبۂ فکر کہا جاتا ہے۔ بڑا عمدہ جملہ ہے۔ انہوں نے اللہ کی اطاعت اور محمد کی اطاعت میں فرق کیا، اور کہا کہ اللہ کی صرف اطاعت ہوگی اور محمد کی اطاعت بھی ہوگی، اتباع بھی ہوگا۔ اس میں فرق کیا ہے۔ فرق یہ ہے کہ اللہ جو کچھ کہتا ہے وہ کرو اور جو کچھ وہ کرتا ہے اسے تم کر ہی نہیں سکتے وہ تو خالق ہے، اس کی شان تو کن فیکون ہے، وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے: فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝ کیسے اتباع کروگے۔ وہ تو صرف یہ ہے کہ وہ کہتا ہے، یہ کرو، وہ کرو، یہ حلال ہے، وہ حرام ہے، مان لیا تو اطاعت ہوگئی۔ مگر نبی کے ساتھ رشتہ جدا ہے۔ جو کچھ وہ کہتے ہیں وہ بھی کرو اور جو کچھ وہ کرتے ہیں وہ بھی کرو۔

دیکھئے کس قدر عمدہ بات ہے، اسے عام کیجئے، اُن کے حوالے سے کیجئے، اس لئے کہ بہرحال CREDIT انہیں کو جاتا ہے۔

میں نے کل عرض کیا تھا اور ایک بات کا بار بار حوالہ دیا۔ پروفیسر

یوسف سلیم چشتی کے حوالے سے حق بحقدار رسید۔ جب بھی بات کہوں گا، اُن کا حوالہ دوں گا اور اب جب بھی یہ بات کہوں گا مفتی صاحب کا حوالہ دوں گا بہت پیاری بات ہے، لیکن اب سوچیئے، اس کے لئے لازم ہے کہ سیرت کا وہ نقشہ تو لوگوں کے سامنے لاؤ کہ محمدؐ نے جو کچھ کیا انسانی سطح پر کیا۔ ان تمام موانع کے علی الرّغم کیا ہے جو کسی بھی انسان کو پیش آسکتے ہیں۔ ان تمام مصائب اور تکالیف کو جھیل کر کیا ہے جو کسی بھی انقلابی جدّ و جُہد میں پیش آتے ہیں، ایک شعر ہے، کس کا ہے، یہ نہیں بتاؤں گا، شعر اچھا ہے ؎

اس راہ میں جو سب پہ گذرتی ہے سو گذری ❊ تنہا پسِ زنداں، کبھی رسوا سرِ بازار

جو سب پہ گذرتی ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پہ گذری۔ ہمارے ہاں، جیسا کہ میں نے عرض کیا جو بھی نقشہ ہے اس کو آپ یوں کہہ سکتے ہیں، ایک پرستش کی شئے، ایک قابلِ پرستش وجود، ایک ARTICAL OF WORSHIP جو بنا دیا گیا۔ لیکن وہ نقشہ سامنے نہیں آتا کہ جس سے کوئی درسِ عمل ملے، جس سے کچھ کرنے کا داعیہ پیدا ہو، جس سے آپ کے نقشِ قدم کے اتباع کا جذبہ ابھرے۔ یہ دو انتہائیں ہیں اور ان دونوں کے بین بین ہے سیرت النبی علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسّلام۔ اِس کو سمجھنے کے لئے سب سے پہلے یہ سمجھئے کہ میں نے ایک لفظ استعمال کیا تھا ASSESS کرنا کارنامۂ حیات کا، اس کے لئے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ جس شخص کے بھی کارنامۂ حیات کو آپ ASSESS کرنا چاہیں پہلے معیّن کیجئے کہ اس کا مقصد کیا ہے تب ہی تو معلوم ہوگا کہ کس حد تک اس کی تکمیل ہوئی اور کس طرز سے تکمیل ہوئی، پہلے اس مقصد کا تعیّن ہونا چاہیئے اور اس کے لئے آپ ہی کی شان میں نازل شدہ یہ آیۂ مبارکہ ہے :

هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ ؕ

اس کے ایک ایک لفظ پر غور کیجئے، یہ الفاظ قرآن مجید میں تین مقامات پر جوں کے توں بغیر کسی ایک شوشے کے فرق کے وارد ہوئے ہیں۔ دو مقامات پر الفاظ آئے ہیں : ”وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ“ سورۂ صف اور سورۂ توبہ میں — اور

ایک مقام پر الفاظ آتے ہیں : وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ط (سورۃ الفتح) یعنی آیت کے آخری الفاظ میں فرق ہے۔ لیکن یہ جو آپ کے سامنے لکھا ہوا ہے :
(مسجد میں لگے ہوئے ایک مانٹو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) (هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ط)
بعینہٖ بغیر کسی شوشے کے فرق کے یہ الفاظ قرآن مجید میں تین مرتبہ آئے ہیں۔ ان الفاظ کی اہمیت اسی سے ظاہر ہوگئی۔ میں عرض کیا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے پاس VOCABULARY کی کمی نہیں اور عربی زبان کا دامن تنگ نہیں۔ عربی زبان اپنی وسعت کے اعتبار سے ضرب المثل ہے اور اللہ تعالیٰ کی (نعوذ باللہ) VOCAB-ULARY SHORT نہیں۔ اس کے باوجود انہی الفاظ کو دُہرا کر لانا جس معاملے میں بھی ہوا ہے، وہ یقیناً ان الفاظ کی اہمیت پر دلالت کرتا ہے۔ پھر دوسری حقیقت یہ ہے کہ یہ الفاظ حضورؐ کے لئے تین دفعہ آئے اور یہ الفاظ کسی دوسرے رسول کیلئے ایک مرتبہ بھی نہیں آئے، بلکہ اس کے آس پاس کے الفاظ بھی نہیں آئے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ ان آیات کا خصوصی تعلق بعثتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے ہے۔ رسالتِ محمدی کی غرض وغایت کے لئے یہ الفاظ خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ بھی نوٹ کر لیجئے امام الہند شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے "ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء" نامی ایک بڑی معرکۃ الآراء کتاب لکھی ہے جس میں خلافت پر گفتگو کی ہے۔ اس لئے اس سلسلۂ تقاریر میں اس کتاب کا حوالہ بھی آجائے تو کوئی حرج نہیں۔ چند آیات کو انہوں نے بعثتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے ضمن میں مرکزی اہمیت کا حامل قرار دیا ہے۔ ان میں یہ آیت سرفہرست ہے۔ بلکہ ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم نے مجھے بتایا تھا کہ کسی جگہ شاہ صاحب کی تصانیف میں انہیں یہ جملہ بھی ملا کہ یہ آیت پورے قرآن مجید کا محور ہے، عمود ہے۔ اس کو سمجھ کر پڑھیں گے تو قرآن مجید سمجھ میں آئے گا۔ گویا یہ کلید ہے فہم قرآن کے لئے۔

اور میں اب جو کچھ عرض کر رہا ہوں، اس سے یہ بات واضح ہو جائے کہ فہم قرآن کے لئے کلید ہو نہ ہو۔ شاید اس میں کسی قدر اختلاف کی گنجائش نکل آئے۔ تاہم سیرتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے فہم کے لئے یقیناً محور ہے، یقیناً عمود ہے!

یقیناً کلید ہے۔ مولانا عبید اللہ سندھی نے اسے اسلام کے عالمی انقلاب کا عنوان قرار دیا۔ اب اس آیت پر غور کیجیے: هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ الخ وہی ہے جس نے بھیجا اپنے رسول کو۔ یہ هُوَ کی ضمیر، سابقہ آیات میں اللہ کا جو ذکر آیا ہے اس کی طرف جا رہی ہے۔ سورۂ صف اور سورۂ توبہ میں اس سے متصلاً پہلے جو آیت ہے اس میں ذرا سا لفظی فرق ہے:

یُرِیْدُوْنَ لِیُطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ○ "یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے منہ سے بجھا دیں، اللہ اپنے نور کا اتمام فرما کر رہے گا، خواہ ان کافروں کو کتنا ہی ناگوار ہو"

هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى اب یہاں هُوَ کا لفظ بالکل جُڑ جاتا ہے! (وہی اللہ ہے جس نے بھیجا اپنے رسول کو!) رسول کوئی مشکل لفظ نہیں ہے۔ اَرْسَلَ یُرْسِلُ ارسال کا معنی بھیجنا ہے۔ اُردو میں یہ لفظ عام طور پر بولا جاتا ہے، مثلاً "خط ارسال کیا" "آپ کا مرسلہ ملا" وغیرہ اس سے مفعول مُرْسَلٌ بنتا ہے اور لفظ رسول اس معنیٰ میں صفتِ مشبہ ہے۔

یہاں ذرا ایک بات اور نوٹ کر لیجیے کہ انبیاء و رسل میں سے جن کو اولوالعزم کہا گیا۔ وہ خصوصی مرتبے اور شان کی حامل برگزیدہ ہستیاں ہیں ان کے ساتھ کچھ نسبتیں معروف ہیں، مثلاً آدم صفی اللہ، نوح وجیہ اللہ، ابراہیم خلیل اللہ، اسمٰعیل ذبیح اللہ، موسیٰ کلیم اللہ، عیسیٰ روح اللہ اور محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) یعنی جامۂ رسالت بتمام و کمال راست ہر شخصیتِ محمدی پر (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) آپ کا امتیازی وصف ہی یہ ہے کہ آپ رسول ہیں۔ گویا کہ خلّتِ الٰہی اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ گئی حضرت ابراہیم پر (علیٰ نبیّنا و علیہ الصلوٰۃ والسلام) سب! اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا۔ قرآن مجید میں دوسرے انبیاء و رُسُل کی عظمت کا جو پہلو ہے اس کو چھپایا نہیں گیا بلکہ اجاگر کیا گیا۔ یہ تو ہمارے تنگ ذہن ہیں کہ جب ہم کبھی سیرت النبی کا بیان کرنے بیٹھتے ہیں تو اس طور سے کرتے ہیں کہ دوسرے رسولوں کی تنقیص کر گذرتے ہیں۔ حالانکہ ہمارے ہاں جو تعلیم ہے اور جو ہمارے ایمان کا جزو ہے، یہ ہے کہ

"لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ" اور حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی تعلیم تو یہ ہے کہ تواضع کا یہ عالم ہے کہ آپ نے حکم کے انداز میں فرمایا کہ مجھے یونس ابنِ متّٰی پر بھی فضیلت مت دو۔ اب یہ حضرت یونس کون ہیں۔ انبیاء و رُسُل کی کل جماعت میں سے جن کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے۔ یہ واحد نبی ہیں جن سے کچھ لغزش ہو گئی تھی، خطا ہو گئی تھی، غلطی کا صدور ہو گیا تھا، حکمِ خداوندی کے آنے سے پہلے قوم کو چھوڑ کر چلے گئے۔ اِس دُنیا میں گرفت ہوئی، مچھلی کے پیٹ میں رہے، اس کے بعد توبہ کی ہے، توبہ قبول ہوئی ہے۔ پھر انہیں وہاں سے نجات ملی ہے۔ انبیاء و رُسُل کے جو قصص قرآن میں آئے ہیں ان میں سے ایک واقعہ ان کا بھی ہے ان کا نام لے کر حضورؐ نے فرمایا کہ مجھے یونس ابن متّٰی پر بھی فضیلت مت دو۔ حضرت موسیٰ علیہ السّلام کے بارے میں ہے: وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا۔ داؤد علیہ السّلام کے بارے میں ہے: وَاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا۔ زبور حمدِ الٰہی کے وہ ترانے ہیں کہ جن کا مثل دُنیا میں کہیں نہیں ملتا۔ وہ جب حمدِ الٰہی کے ترانے الاپا کرتے تھے تو پہاڑ وجد میں آجاتے تھے۔ پرندے ان کے ساتھ شامل ہو جاتے تھے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا ان پر ایک خاص احسان تھا۔ حضرت موسیٰ اشعری رضؓ کو حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ایک دفعہ رات کے وقت، جب کہ آپ ان کے مکان کے پاس سے گذر رہے تھے، قرآن مجید لحنِ داؤدی کے ساتھ پڑھتے سُنا، حضورؐ کافی دیر تک کھڑے سنتے رہے، صبح ملاقات ہوئی تو فرمایا: یا ابا موسیٰ لقد اوتیت مزمارًا من مزامیر آل داؤد (اے ابو موسیٰ! اللہ نے تمھیں تو آلِ داؤد کے سازوں میں سے ایک ساز عطا کیا ہے!) تو ان فضائل کے بیان کرنے میں بخل کا کیا کام؟ بلکہ انہیں اجاگر کیا گیا۔

وَرَسُوْلَهٗ: معلوم ہوا کہ یہ نسبت اپنے عروج کو پہنچ گئی ہے حضرت محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم پر۔ کل تھوڑا سا اشارہ کیا تھا، نبوّت و رسالت کے فرق کی طرف۔ نبوّت ایک ذاتی حیثیّت ہے اور رسالت ایک منصب ہے۔ یہ منصبِ رسالت اپنے عروج کو پہنچا محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی ذاتِ گرامی میں: هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ الخ (وہی ہے جس نے بھیجا

اپنے رسول کو الخ) اس کے بعد حرف 'با' آیا ہے : بالھدیٰ و دین الحق ۔ یہ حرفِ جار ہے یعنی ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ، گویا دو چیزیں دے کر بھیجا ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو۔ ایک 'الھدیٰ' اور ایک "الدّین الحق"۔ 'الھدیٰ' کیا ہے۔ اس پر تقریباً اجماع ہے کہ اس سے مراد قرآن مجید ہے۔ راہنمائی، انسانی فکر کے لئے، انسانی سوچ کے لئے، کامل رہنمائی، ابدالآباد کے لئے وہ الہدیٰ۔ لفظِ ہدایت، قرآن مجید اپنے لئے استعمال کرتا ہے گویا کہ اسمِ عَلَم کے طور پر، یہ هُدًى لِلنَّاس ہے : شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۔ یہ هدًى لِلْمُتَّقِيْنَ ہے۔ یہاں دونوں جگہ پر بطورِ اسم آیا ہے۔ فعل کی صورت میں آیا ہے : اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ میں۔ بالھدیٰ.... کامل و مکمل ہدایت ۔ قرآن مجید دے کر بھیجا گیا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اب اس بات کو کل والی بات کے ساتھ جوڑ لیجئے :

میں نے عرض کیا تھا کہ نوعِ انسانی کے قافلے نے بھی ارتقائی مراحل طے کئے، ارتقاء کا سفر طے کیا، تقریباً ۷۰۰ قبل مسیح سے لے کر ۶۰۰ بعد مسیح تک انسانی سوچ اپنی پختگی کو پہنچ گئی۔ انسان بحیثیت انسان جو کچھ سوچ سکتا تھا، سوچ چکا، اس میں فلاسفۂ یونان بھی آ گئے، فلاسفۂ ہند بھی، گوتم بدھ بھی آ گیا اور مہابیر بھی، اس میں کینفیوشس بھی آ گیا۔ غرض جتنے حکماء و فلاسفہ و اہلِ منطق اور دوسرے سوچنے والے لوگ تھے، اس بارہ سو سال کے عرصہ میں پیدا ہو گئے۔ اور اب وہ الھدیٰ دے دی گئی۔ دیکھئے! تورات ہدایت نامہ ضرور تھی، الہدیٰ نہیں تھی، اگر وہ الہدیٰ ہوتی : کامل و مکمل ابدی ہدایت تو اس کو محفوظ کر لیا جاتا اس کی حفاظت کا ذمہ اللہ نے نہیں لیا، وہ محفوظ نہیں رہی حالانکہ سوچئے! کتاب بہر حال وہ بھی اللہ ہی کی تھی، اور اللہ اگر اس کی حفاظت کا ذمہ لے لیتا تو کون اس میں تحریف کر سکتا تھا، لیکن نہیں۔ ابھی یہ کتاب ارتقائی مراحل طے کر رہی ہے : لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ ...... بڑی اہم آیت ہے سورۂ حدید کی اگر انسان کو کوئی مزید ہدایت

دی جاتی ہوتی، اگر اس میں کسی اضافے کا کسی پہلو سے کوئی امکان ہوتا تو ابھی ختم نبوت غیر منطقی بات ہو جاتی، منطقی بات یہی ہے کہ انسان الھدیٰ کے حامل ہونے کے اہل ہو چکا ہے۔ اسے یہ الھدیٰ تھما دی گئی تا قیام قیامت۔ یہ وہی انسان کے ذہنی بلوغ کا معاملہ ہے جسے علامہ اقبال نے ختم نبوت کے لئے بطور دلیل استعمال کیا۔ جن حضرات نے علامہ کا وہ مقالہ پڑھا ہو وہ ذہن میں اس کو تازہ کریں۔ انسانی ذہن کے ارتقاء کا جو مرحلہ آگیا تھا، اس کا تقاضا تھا کہ انسان اب اس عہدِ طفولیت سے نکل چکا ہے، جہاں قدم قدم پر اسے کہا جائے کہ یہ کرو اور یہ نہ کرو۔ ایک بلوغ عقلی بھی ہے جہاں پہنچ کر یہ استعداد پیدا ہو جاتی ہے اور انسان اس قابل ہو جاتا ہے کہ اب اسے جامع اور کامل ہدایت دے دی جائے بنیادی ہدایت نامہ دے دیا جائے۔ اور اب اسے چھوڑا جائے، اجتہاد کا دروازہ کھول دیا جائے۔ جیسے جیسے حالات بدلیں اب اجتہاد کرو۔ واقعہ یہ ہے کہ جدید دور کا انسان نفسیاتی اعتبار سے اس کی جو PHYCHOLOGICAL CONSTRUCTION ہے، وہ بہت زیادہ احکام اور بہت زیادہ تفصیلی ہدایات (INSTRUCTIONS) کو پسند نہیں کرتا۔ جس طریقے سے کہ ایک بالغ نظر انسان اس کو پسند نہیں کرے گا بلکہ اپنی توہین سمجھے گا کہ ایک ایک DETAIL اس کو بتائی جا رہی ہے۔ اسی طرح نسلِ انسانی کے عقلی بلوغ کا یہ تقاضا تھا کہ ایک جامع ہدایت دینے کے بعد اب انسان کو ایک آزادی دی جائے۔ علامہ نے تو یہ بات یہاں تک کہی ہے کہ شخصی اطاعت اب ختم ہو چکی۔

آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ نبی شخصاً مطاع ہوتا ہے، وہ اپنی ذات میں مطاع ہے، اس کی اطاعت لازم ہے، نوعِ انسانی اب عقلی بلوغ کی اس سطح پر پہنچ چکی تھی کہ شخصی اطاعت اس پر گراں گذرنے والی تھی۔ لہٰذا اب یہاں یہ کہا گیا کہ اب کوئی شخص اپنی ذاتی حیثیت میں مطاع نہیں رہا۔ کتاب و سنت ہمارے پاس ایک علمی سرمایہ ہے، کوئی شخص معین یہ نہیں کہہ سکتا کہ میرا کہنا مانو، میری اطاعت کرو۔ وہ سلسلہ محمد رسول اللہ پر ختم ہو گیا۔ نبوت بیشک شخصی اطاعت کو لازم کرتی ہے۔ نبی کی ہر بات، اس کے چشم و ابرو کی ہر حرکت حکم

ہے۔ اس کا ایسے ہی سرسری طور پر کچھ کہہ دینا بھی حکم شمار ہوگا۔ وہ کہے نہ بلکہ صرف عمل کر رہا ہو تو وہ بھی واجب الاتباع ہو جائے گا۔ شخصی اعتبار سے بھی درحقیقت وہی عقلی بلوغ ہے نسلِ انسانی کا۔ یہ اسی کے COROLLARIES (متضمنات) ہیں ؎

تو الھدیٰ دے دی گئی اور اس کی حفاظت کا ذمہ لے لیا گیا، اب اگلی چیز ہے "ودین الحق!" یہ دین حق کیا ہے۔ یہ دو الفاظ سے مل کر بنا ہے اور بظاہر مرکب اضافی ہے — حق کا دین — لیکن عام طور پر اس کا ترجمہ "سچا دین!" مرکب توصیفی کی شکل میں کیا جاتا ہے، جبکہ ہے یہ مرکب اضافی تو عربی زبان میں ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ مرکب توصیفی بشکل اضافت آتا ہے۔ اگر اس کا تجزیہ کریں گے تو معنی ہوں گے 'حق کا دین'۔ حق کون ہے؟ از روئے قرآن، ذاتِ حق سبحانہٗ وتعالیٰ وہ صرف ایک ہے:

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَمَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ هُوَ الْبَاطِلُ — وما بعد الحق الا الضلال۔ الحق صرف ذاتِ باری تعالیٰ ہے۔ دین الحق مرکب اضافی بنائیے تو معنی ہوں گے ذاتِ حق کا دین یعنی اللہ کا دین اور اللہ ہی حق ہے، اور اگر اس کو مرکب توصیفی سمجھا جائے تو 'سچا دین' معنی ہوں گے۔ اب لفظِ دین کی طرف آئیے:

دَانَ یَدِیْنُ عربی زبان میں بدلے اور اطاعت کے لئے آتا ہے اس کا جو بالکل بنیادی مفہوم ہے وہ 'بدلہ' ہے — جزاء و سزا۔ چنانچہ سورۂ فاتحہ میں جو اساس القرآن اور اُمّ القرآن ہے، یہ لفظ اسی معنی میں آیا ہے — مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کا مطلب ہے 'بدلے کے دن کا مالک'۔ 'جزاء و سزا کے دن کا مالک' — عربی زبان میں ایک کہاوت ہے: "كَمَا تَدِيْنُ تُدَانُ!" یعنی (جیسا کرو گے ویسا بھرو گے) اور ایک مصرع بہت مشہور ہے: فَدِنَّاهُمْ كَمَا دَانُوْا۔ کہ جیسے انہوں نے ہمارے ساتھ سلوک کیا، ہم نے بھی اُن کے ساتھ ویسا ہی کیا! — بدلہ اور جزاء و سزا کے مفہوم سے۔ اب یہ لفظ ذرا اور اوپر اٹھتا ہے، جزاء سزا کے ساتھ لازم و ملزوم ہے کوئی قانون، کوئی ضابطہ جس

کی اطاعت کی جائے تو جزا ہے، خلاف ورزی کی جائے تو سزا ہے۔ لہٰذا 'دین' قانون کے معنی میں بھی مستعمل ہوتا ہے۔ دین اطاعت کے معنی میں بھی مستعمل ہوتا ہے اور ان سب سے بڑھ کر ذہن میں رکھئے کہ یہ قرآن مجید کی اصطلاح بھی ہے۔ 'دین' سے مراد ہے ایک پورا نظامِ زندگی، ایک منظم زندگی اور منظم زندگی کے لئے لازم ہے کہ اس میں مطاع کا تعین کیا جائے۔ اب یہ بات پولیٹیکل سائنس کے طلبہ بڑی آسانی سے سمجھیں گے کہ کسی ملکی نظام میں سب سے پہلے جو مسئلہ طے ہوگا وہ یہ کہ SOVERIGNITY کون ہے، SOVERIGN کس کی ہے۔ نظام جو بھی بنے گا اس میں سب سے پہلے یہ طے کرنا پڑے گا کہ اختیار کس کا ہے۔ ہر نظام کسی ایک اختیار کے گرد قائم ہوتا ہے، اس کے تحت وجود میں آتا ہے جس کی اطاعت کا وہ نظام ہوگا، اس کا وہ دین قرار پائے گا۔ مثلاً قرآن مجید میں آیا: دین الملک (سورۂ یوسف) حضرت یوسف علیہ السلام اپنے بھائی بنیامین کو روکنا چاہتے تھے۔ اس وقت جو ملکی قانون تھا، بادشاہی نظام کے تحت رائج تھا۔ حضرت یوسف علیہ السلام بادشاہ تو تھے نہیں، البتہ وہ ایک بڑے عہدے پر فائز تھے: قال الملک ائتونی بہ الخ کہ بادشاہ نے ان کی تعبیر سن کر کہا کہ "اسے میرے پاس لاؤ!" استخلصہ لنفسی۔ میں اسے اپنا بنالوں!۔ اپنا ہی ہم نشیں کہہ لیں ... تو چونکہ وہ نظام ان کا نہیں تھا، اس نظام کے تحت جو جاری تھا وہ انہیں پکڑ نہیں سکتے تھے، روک نہیں سکتے تھے: ما کان لیاخذ اخاہ فی دین الملک (وہ اپنے بھائی کو اس بادشاہی قانون، بادشاہی نظام کے تحت جو مصر میں رائج تھا، روک نہیں سکتے تھے!) کَذٰلِکَ کِدْنَا لِیُوْسُفَ الخ۔

اس طرح یوسف علیہ السلام کے لئے ہم نے وہ شکل پیدا کردی جس سے کہ حضرت یوسفؑ اپنے بھائی کو روک سکیں۔ دین الملک کو سمجھ لیجئے، جہاں مختارِ مطلق ہے بادشاہ، حاکمیت ہے اس بادشاہ کی، پورا نظام اس کے تحت ہے، وہ دین الملک ہے۔ یہاں سے ایک دم چھلانگ لگائیے اور سوچئے کہ دین اللہ کیا ہے۔ عجیب بات یہ ہے قرآن مجید میں دین الحق تین جگہ آیا ہے اسی آیت کے

ضمن میں اور تین ہی جگہ 'دین اللہ' آیا ہے۔ ایک تو سبھی کو یاد ہوگا: اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا۔ سورۂ نور میں آیا ہے کہ زانی اور زانیہ کو سزا دو، کوڑے لگاؤ اور دیکھو! اللہ کے اس قانون میں، اِس قانون کے تحت حد جاری کرتے ہوئے، اُن کے لئے کوئی رحم کا جذبہ تمہارے اندر پیدا ہو کر آڑے نہ آجائے۔ وَلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ۔ دین اللہ کے کیا معنیٰ ہیں۔ اللہ کا قانون، اللہ کی قائم کردہ اور متعین کردہ حد۔ تم اللہ سے بڑھ کر شفیق اور وَدود نہیں ہو، تم اللہ سے بڑھ کر رحیم نہیں ہو۔ جب اللہ تعالیٰ نے اس جرم کی یہ سزا مقرر کی ہے تو: وَلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ۔ اور اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ یہ بڑی وحشیانہ سزا ہے، تو گویا وہ یہ سمجھتا ہے کہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ سے بڑھ کر خلق کے حق میں وَدود بھی ہوں، رحیم بھی ہوں، شفیق بھی ہوں۔

اور ایک مرتبہ سورۂ آلِ عمران میں آیا: اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا (کیا یہ اللہ کے دین کے سوا کوئی اور دین چاہتے ہیں۔ حالانکہ آسمان و زمین میں جو کچھ ہے وہ اس کی اطاعت کر رہا ہے) اب یہ دین اللہ اور دین الحق کو اچھی طرح ذہن میں متعین کر لیں۔ وہ نظامِ زندگی جو اطاعتِ خداوندی کے اصول پر قائم ہو۔ اس نظام میں مطاعِ مطلق انسان نہیں ہے، اس میں انسان، انسان کا حاکم نہیں، نہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا حاکم، نہ انسان خود اپنا حاکم، دونوں کی نفی۔

ابھی تک انسان کی سوچ جتنی بلند گئی ہے اس کے پیشِ نظر آزادی کا تصور یہ ہے کہ کوئی انسان دوسرے انسان کا، کوئی قوم دوسری قوم کی حاکم نہ ہو، لیکن اپنی حاکمیت، یہ تو گویا اب تک تو معراج ہے اپنی سوچ کی، ہماری اجتماعی سوچ کا معیار یہی ہے۔ جمہوریت! وہ تو گویا کہ سب سے اعلیٰ قدر ہے اس دور کی جس میں POPULAR SOVERIGNITY ہے، جسے عوامی حاکمیت کا نام دیا جاتا ہے، قرآن اس کی بھی نفی کرتا ہے، بقول علامہ اقبال ؎

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے ❊ حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آذری!

چاہے وہ خود ہو چاہے ایک قوم اپنے اوپر خود حکومت کی دعویدار ہو۔ یہ بھی اتنا ہی بڑا شرک ہے جتنا کہ کوئی اور شخص کسی پر حاکمیت کا دعویدار ہو کر آجائے۔ ان میں نوعیت کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں۔ دینِ اللہ کیا ہے؟ کہ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کی بنیاد پر پورا نظامِ زندگی قائم ہو جائے اور اس کو قرآن اس طرح بھی تعبیر کرتا ہے: قَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۔۔۔ یہ الفاظ دو جگہ آئے ہیں، سورۂ بقرہ میں تو كُلُّهٗ کا لفظ نہیں ہے: قَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ۔ اور بقرہ کے فوراً بعد ترتیبِ نزولی میں آتی ہے سورۂ انفال۔ ترتیبِ مصحف میں خاصہ فاصلہ ہے، ترتیبِ نزولی میں متصل ہے، وہاں یہ الفاظ اور اضافے کے ساتھ: وَيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ دین کل کا کل اللہ کا ہو جائے، حصے بخرے نہ رہیں کہ زندگی کا اتنا حصہ اللہ کی اطاعت میں، اتنا اپنی مرضی سے، اتنا زمانے کے چلن کے مطابق، اتنا بازار کے رواج کے مطابق، یہ سب سے بڑا شرک ہے۔ یہ دین بانٹ لینا ہے۔ زندگی کا ایک حصہ دینِ اللہ میں، ایک حصہ دینِ نفس میں، ایک حصہ دینِ رواج میں یا دینِ قانون میں جو بھی دنیا میں چل رہا ہو، اس سے بڑا شرک اور کوئی نہیں: وَيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ (پورے کا پورا دین اللہ کا ہونا چاہیئے!)

اس لفظِ دین پر ایک اور اعتبار سے بھی غور کیجیئے، یہ عجیب باتیں ہیں جیسا کہ میں نے کل عرض کیا تھا، پورے قرآن مجید میں لفظِ شہید اس معنی میں نہیں آیا، جو فوراً ہمارے ذہن میں آجاتا ہے۔ اسی طرح پورے قرآن مجید میں پورے ذخیرۂ حدیث میں مذہب کا لفظ اس معنی میں نہیں آیا جس معنی میں ہم بولتے ہیں، قرآن مجید میں لفظ مذہب سرے سے ہے ہی نہیں۔ ہماری گفتگو میں عام طور پر پوچھا جاتا ہے: آپ کا مذہب کیا ہے اور جواب میں 'اسلام' کہہ دیا جاتا ہے۔ اسلام مذہب نہیں، دین ہے۔ زیادہ صحیح کہنا چاہیں تو یوں کہیں کہ اسلام صرف مذہب نہیں بلکہ ایک کامل دین ہے، مذہب ایک جزو ہے، وہ انسانی زندگی کے صرف ایک گوشے سے بحث کرتا ہے۔ کچھ اعتقادات ہیں، کچھ RITUALS ہیں۔ رسومات ہیں اور جدید SECULAR۔ انتہائی سیکولر ذہن

بھی اس کی نفی نہیں کرتا۔ آپ کہ سچین ہوں ٹھیک ہے، آپ جو چاہیں عقیدہ رکھیں، آپ اپنے RITUALS ادا کریں۔ اجتماعی زندگی کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ آپ مسلمان ہیں، آپ ہندو ہیں، آپ سکھ ہیں، آپ عیسائی ہیں اپنے اپنے عقیدے رکھیئے۔ ہر شخص اپنی اپنی پوجا پاٹ جس طور سے چاہے کرے کچھ پرسنل لاء بھی اپنی حد تک کر لیجئے۔ لیکن LAW OF THE LAND کا تعلق کسی مذہب سے نہیں ہوگا، نہ اسلام سے نہ CHRISTANITY سے، نہ ہندو مت سے، نہ بدھ مت سے، کسی سے نہیں، وہ تو خالص لوگوں کی آزادانہ مرضی پر SOVERIGNITY OF THE PEOPLE کی بنیاد پر طے ہوگا کہ LAW OF THE LAND کیا ہے۔ یہ ہے سیکولرازم۔ سیکولرزم کے معنی مذہب کی نفی نہیں ہیں، وہ تو مذہب کا اثبات کرتا ہے البتہ نفی کرتا ہے دین کی، مذہب کو مانتا ہے۔ اسی لیئے تو ہندوستان جو بہت ہی دعوے کیا کرتا ہے، یہی کہتا ہے کہ ہمارے ہاں پوری مذہبی آزادی ہے، تو اسلام مذہب نہیں ہے، اسلام دین ہے۔ اور دین کے بارے میں یہ بات جان لیجئے کہ جس طرح دو تلواریں ایک نیام میں نہیں سما سکتیں، ایک ملک میں، ایک جگہ پر، ایک خطۂ ارض پر دو نظام بیک وقت نہیں قائم ہو سکتے۔ مذہب دس بھی رہ سکتے ہیں۔ ہندوستان میں ہو سکتا ہے مذہب دس ہوں یا بیس ہوں، نظام ایک ہے تو اسلام دین ہے:

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ ○ اَفَغَیْرَ دِیْنِ اللّٰہِ یَبْغُوْنَ +
وَیَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا ط

میں نے یہ ساری وضاحت کیوں کی۔ آیت کا اگلا ٹکڑا دیکھ لیجئے:

لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ۔ اب دیکھئے! حضورؐ کو دو چیزیں دے کر بھیجا گیا۔ پہلی چیز کا تقاضا ہے ابلاغ و تبلیغ کہ قرآن پہنچا دیجئے۔ یٰٓاَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَہٗ (اے نبی! جو کچھ آپ پر آپ کے رب کی طرف سے نازل کیا گیا اُسے پہنچا دیجئے۔ اگر پہنچانے میں کوئی کمی ہو گئی (بفرض محال) تو یہ فریضۂ رسالت میں کوتاہی شمار ہوگی!۔

بڑی سخت آیت ہے۔ لوگوں کو پسند ہو یا ناپسند، آپ نہیں دیکھ سکتے کہ میں یہ بات کہوں گا تو کیا ہو جائے گا، طوفان امڈ کھڑا ہوگا تو میری یہ بات کیسے قبول کی جائے گی۔ اس بات کے خلاف تو مخالفت کا طوفان اُٹھ کھڑا ہوگا۔ اس کے سوچنے کی اجازت نہیں: بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ۔ اِس میں ایک شوشے کا فرق بھی آپ نہیں ڈال سکتے۔ میں نے کئی دفعہ وہ آیت سُنائی ہے، جو سورۂ یونس میں آئی ہے اور یہ مقام مجھے بہت عزیز ہے، کہا گیا: اِئْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ: اے محمدؐ! یہ قرآن بڑا سخت ہے، RIGID ہے — اور UN-COMPROMISING ہے، آخر کچھ ٹ دے کر بات بنے گی۔ آپ چاہیں کہ کُل کی کُل بات منوا لیں، یہ نہیں ہو سکتا۔ ہم مصالحت کے خواہش مند ہیں، لڑائی نہیں چاہتے۔ لیکن اس میں کچھ ترمیم کیجئے یا اس کو بدل دیجئے یا کوئی اور قرآن لے آئیے۔ جواب دلوایا گیا: قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ، اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ (اے نبیؐ! ان سے کہہ دیجئے میرے لئے یہ قطعاً ممکن نہیں ہے کہ میں اپنی مرضی سے اس میں کوئی تغیّر و تبدّل کر دوں۔ میں تو خود پابند ہوں اُس کا جو مجھ پر وحی کیا جا رہا ہے۔)

تو الھدیٰ کے سلسلے میں چونکہ مکّی سورتوں میں یہ مضمون بار بار آیا ہے کہ قرآن کو پہنچائیے، اِس کی تبلیغ کیجئے، اِس کی اشاعت کیجئے، اِس کی تذکیر کیجئے، اِس سے تبشیر کیجئے، اِس کی تذکیر کیجئے: ذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ + اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ + وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا كَبِيْرًا۔ تو معلوم ہوا کہ یہاں اس کے اعادے کی ضرورت نہیں۔ الھدیٰ دے کر بھیجے گئے تاکہ اُس کو پہنچا دیں جیسا کہ اُس کو پہنچانے کا حق ہے اور دینِ حق دے کر بھیجے گئے، تاکہ اس کو غالب کریں پورے کے پورے دین پر۔ یہ نظام قائم ہونے کے لئے آیا ہے، یہ نظام حجّت اُسی وقت ہوگا جب کہ اس کو قائم کر کے دکھا دیا جائے گا۔ اس کا تعلّق اس دوسری بات سے ہے جو میں نے کل عرض کی تھی۔ بہرحال یہ ایک سلسلۂ تقادیر ہے، ذہن میں ان کڑیوں کو جوڑتے جائیے کہ نوعِ انسانی نے ایک دوسرا سفر طے کیا۔ ایک عقلی بلوغ اور ایک

اجتماعی شعور کے بلوغ کا۔ وہ قبائلی زندگی، وہ شہری ریاستیں اور پھر وہ بڑی عظیم سلطنتیں اور مملکتیں اور اس دور کا آغاز ہو رہا تھا جب کہ انسانی زندگی پر اجتماعیت کی گرفت ہمہ گیر ہو جانے والی تھی۔ ایک سادہ سی مثال ہے جیسے میں آپ کو سمجھا دوں کہ میری اس بات کا مطلب کیا ہے؟ آپ کا ایک خاص نقطۂ نظر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو توفیق دی ہے، آپ مسلمان جینا اور مرنا چاہتے ہیں، آپ یہ بھی چاہتے ہیں کہ اپنی اولاد کو بھی اسی نقطہ پر پروان چڑھائیں لیکن کیا کریں بے بس ہیں۔ ایک پورا نظام ہے اس نظام کے تحت اس کا نصاب متعین ہوتا ہے۔ بڑے بڑے ایکسپرٹ بیٹھے ہوئے ہیں جو تعلیمی پالیسیاں مرتب کرتے ہیں، نصاب کے بارے میں فیصلے ہوتے ہیں، بہت اعلیٰ سطح پر۔ آپ کیا کریں گے آپ مجبور ہیں۔ نو سو ننانوے فی ہزار (999) CASES میں آپ مجبور ہیں کہ اپنے بچے کو اس نظامِ تعلیم کے حوالے کر دیں۔ اس کے بعد آپ کی مرضی کو کوئی دخل نہیں۔ آپ کی پسند، ناپسند یا چاہت کا اس میں کوئی حصّہ نہیں آپ دیکھتے رہیئے اور آپ کی نگاہوں کے سامنے آپ کے بچّے الحاد اور مادّہ پرستی ان کے اندر سرایت کرتی جا رہی ہے بقول اقبال ؎

گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا ؛ کہاں سے آئے صدا لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ

آپ کے لئے سوائے ایک گھٹن کے، سوائے بے چینی کے، سوائے ایک کوفت کے، آپ کے پاس کوئی اختیار نہیں صرف ایک راستہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ توفیق دے دے، بالکل اپنی منزل کو متعین کر لے کہ دنیا سرے سے مقصود نہیں۔ اس کا فیصلہ کرے انسان تو ٹھیک ہے لیکن یہ آخری فیصلہ ہے، یہ انتہائی فیصلہ کرنے کی ہر ایک شخص میں ہمّت نہیں ہے، یہ تو ہزار میں سے ایک کرے گا بلکہ لاکھ میں سے ایک کرے گا۔ اس نظامِ تعلیم سے بالکل کٹ جائیں اور یہ وہ بات بھی جس کو میں آپ سے عرض کر دوں، انگریز کی آمد کے بعد ہمارے ہاں اختلاف ہوا ہے، ایک رائے یہ تھی کہ انگریزی پڑھو ورنہ پیچھے رہ جاؤ گے دُنیا میں۔ اگرچہ وہ رائے بھی خلوص پر مبنی تھی۔ مسلمانوں کا اختلاف اس میں یقیناً موجود تھا۔ دوسری رائے یہ تھی کہ نہیں زمانے سے کٹ جائیں، کوئی پروا نہیں، دقیانوسی قرار

پائیں کوئی پرواہ نہیں، زمانے کا ساتھ نہ دے سکیں پرواہ نہیں۔ لیکن اس تعلیم کے ساتھ، اس نظام کے ساتھ تعاون نہیں کریں گے۔ اب دونوں کے اپنے MERITS بھی ہیں، اور دونوں کی کمزوریاں بھی ہیں لیکن بہرحال فرق وہی ہے، ذہن میں رکھیئے۔ لیکن پوری قوم کا دھارا اُدھر نکل گیا کہ ادھر روٹی کا ٹکڑا لٹکا ہوا تھا، لڑکا میٹرک (MATRIC) پاس کرے گا، کلرک ہو جائے گا بی اے، ایم اے (B.A; M.A.) کرے گا، وکیل بن جائے گا یا کچھ اور ڈاکٹری کرے گا ایک CAREER ہے بڑا روشن CAREER، دین کے لئے کرے گا تو کیا کرے گا، مسجد کی امامت، اور مسجد کی امامت اب تو کچھ بہتر نسخہ بن گیا ہے اب تو گریڈ معیّن ہیں ائمہ کے بھی اور باقاعدہ شرائطِ ملازمت مقرر ہیں، وہ طے ہوتی ہیں، ایک دور وہ تھا جب کہ محلّے کی روٹیوں کے اوپر مسجد کا امام بسر اوقات کرتا تھا۔ یہ ہے وہ نظام۔ پھر میں عرض کر چکا ہوں کہ اس نظام کی پیچیدگیاں اور اس کے مسائل ہیں۔ انفرادی زندگی کی اتنی پیچیدگیاں نہیں ہیں جتنی کہ اس نظامِ اجتماعی کی ہیں۔ فرد کو ذرا سی اہمیّت دیجیئے، اجتماعیت متاثر ہوتی ہے۔ اجتماعی مصلحتوں کا زیادہ لحاظ کیجیئے، انفرادی آزادی اور حریّت پامال ہوتی ہے۔ نقطۂ عدل کہاں ہے، سرمائے کی تھوڑی سی ہمّت افزائی کیجیئے مزدور ظلم کی چکّی میں پسنے لگتا ہے۔ مزدور کی تھوڑی سی پشت پناہی کیجیئے، تو سرمایہ SHY ہو جاتا ہے، وہ آگے نہیں بڑھتا، سرمایہ کاری نہیں رہتی۔ نقطۂ عدل کہاں ہے؟ مرد کو قوّامیّت بھی دیں اور عورت کو STATUS بھی دیں یہ توازن صرف اللہ کے دیئے ہوئے دین میں مکمّل اور ممکن ہے اور کہیں نہیں۔ ذاتی ملکیّت بھی ہو۔ PERSONAL INCENTIVE بھی ہو اور پھر اُونچ نیچ اتنی نہ پیدا ہو سکے جتنی کہ کسی سرمایہ دارانہ نظام میں ہوتی ہے۔ یہ اعتدال سوائے دینِ حق کے اور کہیں نہیں مل سکتا۔ آزادی بھی ہو حُرّیت بھی ہو، تنقید کی آزادی بھی ہو، کہ ایک درویش کھڑا ہو اور کہے عمر فاروق سے کہ "لَا سَمْعَ وَلَا طَاعَةَ لَكَ"۔ ایک بڑھیا کھڑی ہو جائے اور چیلنج کر دے کہ یہ کیا آرڈی ننس آپ نے نافذ کر دیا ہے ہمارے مہر کے لئے، جس کی کوئی حد اللہ تعالیٰ

نے مقرر کی نہ اس کے رسول ؐ نے ، اے عمرؓ! تم کون ہوتے ہو اس پر حدود قائم کرنے والے - اور عمرؓ یہ کہے کہ آج ایک بڑھیا نے عمرؓ کو دین سکھایا ہے - آزادی کا یہ عالم ہو ، ساتھ ہی وہ مساوات بھی ہو کہ سفر کر رہے ہوں حضرت عمر فاروقؓ بیت المقدس کا اور سفر بھی سرکاری تھا - کیونکہ بیت المقدس کا چارج لینے جا رہے ہیں ، کوئی ذاتی سفر نہیں تھا اور کوئی طائفہ بڑا اور کوئی ENTURAGE اور کوئی خدم وحشم کچھ نہیں ایک اونٹ اور ایک غلام ، ایک منزل پر خلیفۂ وقت اگر سوار ہے تو غلام نے نکیل پکڑی ہوئی ہے ، اور آگے آگے چل رہا ہے - تو اگلی منزل پر وہ غلام اوپر بیٹھا ہوا اور خلیفۂ وقت نکیل پکڑے ہوئے آگے آگے چل رہا ہے - یہاں تو یہ ہے کہ مساوات لائیے تو آزادی ختم - یہ دین حق ہے جو ان تمام کے مابین ایک توازن پیدا کرتا ہے ۔

یہ باتیں جو ابھی میں نے عرض کیں سوچیے ! اگر کوئی شخص صرف نظری طور پر کہے کہ ایسا ممکن ہے - مرد قوّام بھی ہو اور عورت پھر بھی جوتی کی نوک نہ بنے ، اس کے حقوق ہوں ، اُس کا STATUS ہو ، اس کو پوری ایک شخصیت دی جائے ، آزادی بھی ہو اور مساوات بھی ہو - ان دونوں چیزوں کو بیک وقت جمع کرنا - اگر آپ نظری طور پر کہیں گے تو کوئی فوراً کہے گا - UTOPIA ہے خیالی ہے ، ہونے والی بات نہیں - جب تک کہ اس کو قائم کر کے اس کو چلا کر نہ دکھایا جائے - یہ ہے فرض منصبی : لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ کے بارے میں کتاب کا دیا جانا تو اس کا تقاضا تو پورا ہو گیا کہ تبلیغ کا حق ادا کر دیا - اور جیسا کہ میں نے عرض کیا وہ مکی سورتوں میں اس قدر کثرت سے آیا ہے کہ اس کو یہاں دُہرانے کی ضرورت نہیں - دین حق جو دیا گیا ہے - آپ کا اس کو نافذ کرنا ، غالب کرنا ، قائم کرنا ، چلا کر دکھانا یہ فرض منصبی ہے ، تب حجت قائم ہو گی نوعِ انسانی پر - یعنی وہ جو بنیادی مقصد تھا بعثتِ انبیاء کا اس کو ذہن میں رکھیے - تمام حجت اِس دَور کے اعتبار سے یعنی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی بعثت ہو رہی تھی - صرف اس طریقے پر ہو سکتا تھا کہ صرف انفرادی آیات نہ ہوں ، صرف اخلاقی تعلیمات نہ ہوں ، صرف نظری طور پر کوئی چیز پیش نہ

کردی جائے۔ ایک مکمّل نظامِ زندگی دیا جائے اور مکمّل نظامِ زندگی کو عملاً قائم کر کے دکھا دیا جائے۔ تب حجّت قائم ہوگی نوعِ انسانی پر۔ یہ اتمامِ حجّت محمّد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا مقصدِ بعثت ہے۔ اب اس کا ایک نتیجہ نکلتا ہے۔ دیکھئے! بڑا فرق ہے وعظ اور نصیحت میں اور اس بات میں کہ آپ کسی غلط نظام کو بیخ و بُن سے اُکھیڑ کر صحیح نظام کو قائم کر رہے ہیں، دونوں میں بڑا فرق ہے ؎ : "زعشق تا بہ صبوری ہزار فرسنگ است!"

وعظ کہئے، نصیحت کیجئے، کہیں ایسا بھی ہوگا کہ آپ کا استہزاء اور مذاق اڑایا جائے، کہیں گلے میں ہار بھی ڈالے جائیں گے، آؤ بھگت بھی ہوگی، دعوتیں بھی ہوں گی، لوگ قدموں میں اپنی نگاہیں بچھائیں گے۔ لیکن یہ کہئے کہ سیدھے ہو جاؤ، ظلم کو ختم کرو، عدل قائم کرو، سب اللہ کے بندے بن جاؤ، کوئی کسی کا آقا نہیں۔ ؎ : "تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیّت ہے!"______ كُونُوا عِبَادَ اللهِ اِخْوَانًا ط کوئی اونچ نیچ نہیں، سب اللہ کے بندے بنو اور بھائی بھائی بن جاؤ۔ حضورؐ نے آخری خطبے میں ارشاد فرمایا کہ آج سارے غرور نسب کے یا خاندانی شرافت کے تصوّراتِ برتری، اعلیٰ مرتبہ ہونے کا خیال، رِبٰو اور دیگر سارے مفادات : "تحت قدمیّ ھاتین!" (میرے ان دونوں قدموں تلے ہیں)

نظام بدلنے کا یہ داعیہ جہاں بھی آئے گا کہیں بھی ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں ہوگا۔ جن کے مفادات پر زد پڑتی ہے، جن کا VESTD-INTE-REST متأثر ہوتا ہے، وہ کبھی برداشت نہیں کریں گے۔ اسی لئے اِن دو مقامات پر جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا : وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ○ اِس دین کو قائم کرنا، غالب کرنا، نافذ کرنا فرضِ منصبی ہے خواہ مشرکوں کو کتنا ہی ناپسند ہو۔ ناپسند ہونا ایک مشرک کا لازمی تقاضا ہے۔ وہ مخالفت کریں گے، قدم قدم پر روڑے اٹکائیں گے، راستے میں کانٹے بچھائیں گے، سر پر راکھ ڈالیں گے، پتھروں کی بارش ہوگی، شعب بنی ہاشم راستے میں آئے گا، یومِ بدر، یومِ اُحد، یومِ احزاب اور یومِ حنین آئیں گے۔ لیکن اس دین کو غالب کرنا ہے، نافذ کرنا، قائم کرنا ہے۔

اس کا ذرا تصوّر کیجئے۔ سورۂ شوریٰ میں الفاظ آئے ہیں : فَلِذٰلِكَ فَادْعُ پہلے یہی مضمون مختلف الفاظ کے ساتھ یوں آیا کہ : اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا (مسلمانو! جو دینِ حق تمھیں دیا گیا ہے وہ اس لئے دیا گیا ہے کہ اسے قائم کرو) اور اس کے بعد حضورؐ سے کہا گیا : فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ! (اے محمدؐ! صلی اللہ علیہ وسلم! اپنے موقف پر ڈٹے رہو، اس کی طرف بُلاتے رہو، اس کی دعوت دو) وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَاءَهُمْ (ان کی خواہشات کی پیروی مت کرنا)— یہ آیات اس دور میں نازل ہوئی ہیں جب اہلِ مکّہ PERSECUTION کے تمام حربے آزمانے کے بعد مایوس ہو کر اب مصالحانہ پیشکش کر رہے تھے، بادشاہت بھی پیش کی، دولت بھی پیش کی، جہاں شادی کرنا چاہیں، اشارہ کر دیجئے۔ یہ پیشکشیں اسی وقت ہوئی ہیں جب انہوں نے دیکھ لیا کہ تشدّد ناکام ہو چکا ہے۔ اس وقت یہ جواب دلوایا گیا :

فَلِذٰلِكَ فَادْعُ وَاسْتَقِمْ كَمَا اُمِرْتَ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَاءَهُمْ وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَا اَنْزَلَ مِنْ كِتَابٍ وَّاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ

مَیں واعظ بن کر نہیں آیا ہوں، مَیں اُس نظامِ عدل کو قائم کرنے آیا ہوں— صرف نصیحت کر دینا اور وعظ کہہ دینا کافی نہیں ہے۔ اس نظام کو بالفعل قائم کر دینا میرا فرضِ منصبی ہے۔ یہ ہے ختمِ نبوّت اور اتمامِ رسالت کا وہ مقام جس کو نہ اپنے سمجھے نہ غیر سمجھے۔ یہ ۲۳ سالہ پوری جِدّ وجُہد محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی نظر آتی ہے اسی مقصد کے لئے !

اب مَیں ایک لفظ جان بوجھ کر بول رہا ہوں۔ مَیں جانتا ہوں کہ نئی اصطلاحات کو زیادہ استعمال نہیں کرنا چاہیئے لیکن یہ بھی جانتا ہوں کہ کسی دَور کی اصطلاحات میں بات نہ کی جائے تو اُس دَور کے لوگوں کے ذہنوں تک ابلاغ نہیں ہوتا۔ ہر دَور کا ایک ذہنی سانچہ بن چکا ہوتا ہے، وہ کچھ اصطلاحات کے حوالے سے سوچتا ہے۔ آپ ۱۴۰۰ برس پہلے کی اصطلاحات میں بات کیجئے، ذہن کے اوپر اوپر سے گذر جائے گی۔ ذہن کے اندر وہ سانچے نہیں ہیں جو اسے قبول کریں اس لئے یہ DIL-EMMA ہے۔ جدید اصطلاحات کی مدد لئے بغیر چارہ بھی نہیں۔ لیکن بالکل انہی کو

اوڑھنا بچھونا نہیں بنانا چاہئے اس لئے کہ جدید اصطلاحات کا اپنا ایک مفہوم ہوتا ہے، آپ ان سے نباہ نہیں کر سکیں گے۔ کوشش کیجئے کہ لوگ اصل اصطلاحات جو قرآن کی ہیں، انہی کے حوالے سے سمجھیں۔ لیکن ابتداءً ابلاغِ ذہنی کے لئے جدید اصطلاحات کا استعمال ناگزیر ہے۔ اس تمہید اور معذرت کے ساتھ اب استعمال کر رہا ہوں کہ حضورؐ کی ۲۳ سالہ جدّ و جُہد ایک عظیم انقلابی جدّ و جہد تھی۔ ایک نظام کو جڑ سے اکھیڑ کر دوسرا نظام برپا کرنا تھا۔ انقلاب صرف وعظ سے نہیں آتا، انقلاب کے اپنے تقاضے ہیں، اس میں تصادم ہوگا، اس میں کش مکش ہوگی، اُس میں قدم قدم آگے بڑھایا جائے گا، ایک قوّت قدم بہ قدم آگے بڑھتی ہے، دوسری قوّت قدم بہ قدم پسپائی اختیار کرتی ہے۔ یہی انقلابی جدّ و جہد ہے جو نہ مستشرقین کی سمجھ میں آئی نہ مغربی مصنّفین کی سمجھ میں آئی اور ہم نے بھی سیرتِ مطہّرہ کو اس کے حوالے سے بالکل نہیں سمجھا۔ دعوت کے نتیجے میں جو قبول کریں، ان کی ایک منظّم جماعت بنالو، ایک منظّم قوّت بنالو۔ اپنے پیشِ نظر انقلاب کی مناسبت سے ان کی تربیت کرو اور پھر اسے معاشرے سے ٹکراؤ، اس ٹکراؤ کے نتیجے میں اس قائم نظام کو اکھاڑ کر نظامِ عدل کو قائم کرنا اس کے کچھ تقاضے ہیں اور نبی اکرم کی سیرتِ مطہّرہ کو اس حوالے سے سمجھنا پڑے گا: "لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ" ــــــ یہ ختمِ نبوّت، یہ ختمِ رسالت، اتمامِ نبوّت، تکمیلِ رسالت کا تقاضا ہے اور حضورؐ کی بعثت کا یہ وہ خاص مقصد ہے جو کسی اور رسول کے لئے قرآن مجید میں نہیں آیا، صرف محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے لئے آیا ہے اور آپ کی ۲۳ سالہ جدّ و جہد کا حاصل ہے۔ ایک طرف وہ کہ الھدیٰ پہنچا دی گئی، نظری طور پر بھی، عملی طور پر بھی ــــــ دوسری طرف وہ دینِ حق عملاً قائم کر دیا گیا۔ وہ کیسے قائم ہوا، اس کے خدّ و خال کیا ہیں؟ اس کے نمایاں مقامات و مراحل کیا ہیں؟ اس پر اِن شاءَ اللہ العزیز اب کل گفتگو ہوگی۔ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی ۲۳ سالہ جدّ و جہد کا ایک اجمالی خاکہ اِن شاءَ اللہ العزیز میں کل آپ کے گوش گذار کروں گا۔

وَ اٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

حج اور عید الاضحیٰ

اور ان کی اصل روح

قرآن حکیم کے آئینے میں

از قلم

ڈاکٹر اسرار احمد

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اسلام کے پانچ ارکان میں سے اوّلین اور اہم ترین تو بلاشبہ کلمۂ شہادت ہے جو ایمان کے قانونی پہلو یعنی "اِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ" کا مظہر ہے، بقیہ چار عبادت کی مختلف صورتوں پر مشتمل ہیں یعنی 'اِقَامَۃُ الصَّلٰوۃ' یا فرض نمازوں کی پابندی — 'ایتاءُ الزَّکٰوۃ'، یا صدقاتِ واجبہ کی ادائیگی۔ 'صَوْمُ رَمَضَان' یا ماہِ رمضان مبارک کے روزے اور 'حجُّ البیت'، یا بیتُ اللہ شریف کا حج!

ان کے مابین ایک دلچسپ تقسیم تو اس اعتبار سے ہے کہ اُن میں سے دو ہر مسلمان پر لازم ہیں خواہ وہ امیر ہو خواہ غریب یعنی صلوٰۃ و صوم اور دو صرف کھاتے پیتے مسلمانوں پر فرض ہیں یعنی زکوٰۃ صرف صاحبِ نصاب پر اور حج صرف صاحبِ استطاعت پر ـــــــ لیکن ایک دوسری اور نمایاں تر تقسیم اس اعتبار سے ہے کہ ان میں سے دو یعنی صلوٰۃ و زکوٰۃ بقیہ دو کے مقابلے میں قدرے اقلیت و اقدمیّت کے حامل بھی نظر آتے ہیں اور عظمت و اہمیّت کے بھی۔ اس لیے بھی کہ قرآنِ مجید میں ان کا ذکر حد درجہ تکرار و اصرار کے ساتھ آیا ہے جبکہ حج کا ذکر کُل تین بار آیا ہے اور صوم کا صرف ایک بار اور اس لیے بھی کہ صلوٰۃ و زکوٰۃ کا تذکرہ مکّی دَور کے آغاز ہی سے شروع ہو جاتا ہے جبکہ صوم و حج کا ذکر صرف مدنی سورتوں میں ملتا ہے۔ مزید برآں بعض ان روایات میں بھی جن میں نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی جنگ کے خاتمے کی کم از کم شرائط کا بیان ہے، شہادتین کے ساتھ صرف صلوٰۃ و زکوٰۃ ہی کا ذکر ملتا ہے، صوم و حج کا نہیں مثلاً حضرت معاذ ابن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جو طویل روایت احمد، بزار، نسائی، ابن ماجہ وغیرہم نے نقل کی ہے اس میں آنحضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے یہ الفاظِ مبارکہ ملتے ہیں کہ:

"اِنَّمَا اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ	مجھے حکم ہُوا ہے کہ جنگ جاری رکھوں یہاں
النَّاسَ حَتّٰی یُقِیْمُوا	تک کہ لوگ نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا
الصَّلٰوۃَ وَیُؤْتُوا الزَّکٰوۃَ وَ	کریں اور گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی
یَشْهَدُوْا اَنْ لَّآ اِلٰهَ	معبود نہیں ہے۔ وہ تنہا ہے اور اس
اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا	کے ساتھ کوئی شریک نہیں
شَرِیْكَ لَهٗ وَاَنَّ مُحَمَّدًا	ہے اور یہ کہ محمدؐ اس کے بندے
عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ	بھی ہیں اور رسول بھی۔ جب وہ یہ
فَاِذَا فَعَلُوْا ذٰلِكَ فَقَدْ	شرطیں پوری کر دیں تو وہ محفوظ ہو گئے
اِعْتَصَمُوْا وَعَصَمُوْا	اور انھوں نے اپنی جانیں اور

دِمَآءَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ	مال بچا لیے اِلّا آنکہ کوئی قانونی
اِلَّا بِحَقِّهَا وَحِسَابُهُمْ	حق واقع ہوجائے۔ رہا ان کے (خلوص
عَلَى اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ [1]	یا عدمِ خلوص) کا حساب تو وہ اللہ کے ذمے ہے!

ایسے محسوس ہوتا ہے کہ شان و شوکت اور عظمت و اہمیت کی اسی ظاہری کمی کی تلافی کے لیے اسلام میں دونوں سالانہ تہواروں کو ان دو ارکانِ اسلام کے ساتھ ملحق کر دیا گیا ہے: یعنی عید الفطر رمضان المبارک کے متصلاً بعد اور عید الاضحیٰ حجِ بیت اللہ کے ساتھ!

عید الاضحیٰ بلاشبہ حج ہی کی توسیع کی حیثیت رکھتی ہے اس لیے کہ حج اس اعتبار سے ایک طرح کی محدودیت کا حامل ہے کہ اس کے تمام مراسم و مناسک ایک متعین علاقے یعنی مکہ مکرمہ اور اس کے نواح ہی میں ادا کیے جاتے ہیں۔ اسی لیے اُس کے ایک رُکن یعنی اللہ کے نام پر جانوروں کی قربانی کو وسعت دے دی گئی ہے تاکہ اس میں روئے زمین پر بسنے والا ہر مسلمان شریک ہوجائے اور یہی عید الاضحیٰ کی اصل حکمت ہے!

سب جانتے ہیں کہ حج اور عید الاضحیٰ دونوں حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شخصیت ہی کے گرد گھومتے ہیں جن کی تعظیم و تکریم روئے زمین کے بسنے والوں کی دو تہائی تعداد کرتی ہے اور ان دونوں کے مراسم و مناسک ان کی حیاتِ طیبہ کے بعض اتفاقات کی یادگار ہی کی حیثیت رکھتے ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے طویل سفرِ حیات کا خلاصہ اور لُبِّ لُباب اگر ایک لفظ میں بیان کیا جائے تو وہ ہے: امتحان و آزمائش جس کے لیے قرآنِ حکیم کی اپنی جامع اصطلاح "اِبْتِلَاء" ہے، چنانچہ سورۂ بقرہ میں اُن کی پوری داستانِ حیات کو ان چند الفاظ میں سمو دیا گیا:

وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ	اور جب آزمایا ابراہیمؑ کو اُس کے

---

[1] یاد ہوگا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ان ہی الفاظ سے استدلال کیا تھا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مانعین زکوٰۃ سے جنگ کے معاملے میں!

رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ (البقرۃ: ۱۲۴) — ربّ نے بہت سی باتوں میں تو اُس نے اُن سب کو پورا کر دکھایا!

واضح رہے کہ قرآنِ حکیم میں انسان کی حیاتِ دُنیوی کی اصل غرض و غایت ہی ابتلا و آزمائش بیان کی گئی ہے۔ بفحوائے الفاظِ قرآنی:

۱۔ اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (الملک: ۲) — وہ جس نے پیدا کیا موت اور زندگی کو کہ تمھیں آزمائے کہ کون ہے تم میں سب سے اچھا عمل کے اعتبار سے!

۲۔ اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَۃٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِیْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِیْعًا بَصِیْرًا (الدھر: ۲) — ہم نے پیدا کیا انسان کو ملے جُلے نطفے سے آزمانے کو، لہٰذا بنایا ہم نے اسے سُننے والا، دیکھنے والا۔

بقول علّامہ اقبال ؎

قُلزمِ ہستی سے تو اُبھرا ہے مانندِ حباب
اِس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی!

اور انسان کی فلاح و کامیابی کا دار و مدار اِس پر ہے کہ وہ اپنے خالقِ حقیقی اور پروردگارِ حقیقی کی معرفت حاصل کرے اور اس کی محبّت سے سرشار ہو جائے۔ جو گویا امتحان ہے اس کی عقل و خِرد کا اور آزمائش ہے اُس کے قلبِ سلیم اور فطرتِ سلیمہ کی ——— اور پھر پورے عزم و استقلال اور صبر و ثبات کے ساتھ قائم و مستقیم رہے اس کی اطاعتِ کُلّی اور فرمانبرداریٔ کامل پر[1] جو گویا امتحان ہے اس کے عزم اور حوصلے کا اور آزمائش ہے اس کی سیرت کی پختگی اور کردار کی مضبوطی کی!

حضرت ابراہیم علیہ السّلام کو بھی سب سے پہلے اسی عقلِ سلیم اور فطرتِ سلیمہ کے

---

[1] یہی وجہ ہے کہ سورۂ بقرہ کی آیت ۱۳۱ میں حضرت ابراہیمؑ کے کل کارنامۂ حیات کا خلاصہ بیان کیا گیا۔ لفظِ 'اسلام' کے ذریعے جس کے معنیٰ ہی حوالگیٔ کامل اور سپردگیٔ کُلّی کے ہیں:

اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ — جب جب کہا اس کے ربّ نے اس سے "حکم مان!" فوراً کہا اُس نے "مَیں نے مانا حکم تمام جہانوں کے پروردگارِ حقیقی کا!"

امتحان سے سابقہ پیش آیا۔ انہوں نے ایک ایسے ماحول میں آنکھ کھولی جس میں ہر طرف کفر اور شرک کے گھٹا ٹوپ اندھیرے چھائے ہوئے تھے اور کہیں بتوں اور مورتیوں کی پوجا ہو رہی تھی تو کہیں ستاروں اور سیاروں کو پوجا جا رہا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک مطلق العنان بادشاہ بھی خدائی حقوق (DIVINE RIGHTS) اور کلی اختیارات کے دعووں کے ساتھ کوسِ لمن الملک بجا رہا تھا۔ گویا شرکِ اعتقادی اور شرکِ عملی دونوں کے دل بادل ظُلُمٰتٌ م بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ کی شان کے ساتھ چھائے ہوئے تھے اور توحید کی کوئی کرن کہیں نظر نہ آتی تھی۔ اس ماحول میں آنکھ کھولنے اور پرورش پانے والے نوجوان نے جب یہ نعرہ لگایا کہ :

اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ	میں نے تو اپنا رُخ پھیر دیا ہے اُس ذات
فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ	کی طرف جس نے پیدا کیا ہے آسمانوں اور
حَنِیْفًا وَّ مَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ط	زمین کو، ہر طرف سے یکسو ہو کر، اور میں
(الانعام : ۷۹)	ہرگز اُس کے ساتھ شرک کرنے والا نہیں !

تو کیا آسمان اور زمین وجد میں نہ آ گئے ہوں گے، اور کون و مکان میں ہلچل نہ مچ گئی ہو گی بقول علامہ اقبالؒ ؎

عُروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں — کہ یہ ٹوٹا ہُوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے!

اور کیا "لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ" کی اس شہادتِ عظمیٰ پر مَلَاِ اَعْلیٰ کی بزمِ "لامکاں" میں "میرِ محفل"[1] نے ایک بار پھر فتحمندانہ انداز میں نہ کہا ہو گا کہ "اِنِّیْ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ !"

اسی کو تعبیر فرمایا گیا سورۂ صٰفّٰت میں ان الفاظ میں کہ :

اِذْ جَآءَ رَبَّهٗ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ ط	جب آیا وہ[2] (ابراہیمؑ) اپنے رب کے
(الصّٰفّٰت : ۸۴)	پاس ایک قلبِ سلیم کے ساتھ۔

---

[1] خدا خود میرِ محفل بود اندر لامکاں خسرو — محمدؐ شمعِ محفل بود، شب جائے کہ من بودم!

[2] کیا یہ صوفیاء کی اصطلاح "سیر اِلَی اللہ" کا قرآنی ماخذ نہیں ہے ؟

عقل و فطرت کی اس آزمائش اور معرفتِ رب کے اس امتحان میں کامیابی کے فوراً بعد شروع ہو گیا 'استقامت[1]' کی جانچ پرکھ کا ایک طویل اور جان گسل سلسلہ جس میں ہر لحظہ امتحان تھا، ہر آن ابتلاء۔ ایک جانب ایک نوجوان تھا اور دوسری جانب پوری سوسائٹی اور پورا نظام۔ گویا "کشاکشِ خس و دریا" کا دیدنی نظارہ! عزم و ہمت کا وہ کونسا امتحان تھا جو اسے پیش نہ آیا، صبر و ثبات کی وہ کونسی آزمائش تھی جس سے وہ دوچار نہ ہوا، حوصلہ تحمل و برداشت اور جذبۂ ایثار و قربانی کی جانچ پرکھ کا وہ کونسا طریقہ تھا جو اس پر آزمایا نہ گیا۔ گھر سے وہ نکالا گیا، معبد میں اس پر دست درازی ہوئی، سرِ عام اس پر ہجوم کیا گیا، دربار میں اس کی پیشی ہوئی اور آگ میں وہ ڈالا گیا۔ بقول شاعر ؎

اس راہ میں جو سب پہ گذرتی ہے سو گذری ۔ تنہا پسِ زنداں کبھی رسوا سرِ بازار
گرجے ہیں بہت شیخ سرِ گوشۂ منبر ۔ گرجے ہیں بہت اہلِ حکم بر سرِ دربار

لیکن نہ کبھی اس کے جوش اور ولولے میں کوئی کمی پیدا ہوئی نہ پائے ثبات میں کوئی لغزش! باپ سے "وَاهْجُرْنِي مَلِيًّا" کی غیظ آمیز جھڑکی کھا کر بھی وہ پورے ادب و احترام اور پورے حلم و وقار کے ساتھ یہ کہتا ہوا رخصت ہوا :

سَلَامٌ عَلَيْكَ ۚ سَأَسْتَغْفِرُ لَكَ	تم پر سلامتی ہو! میں اپنے پروردگار سے
رَبِّي ۖ إِنَّهُ كَانَ بِي حَفِيًّا ۝ وَ	تمہارے لیے معافی کی درخواست کروں گا
أَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُونَ مِن	حقیقتاً وہ مجھ پر بڑا مہربان ہے اور میں اعلانیہ
دُونِ اللَّهِ وَأَدْعُو رَبِّي ۖ عَسَىٰ	برأت کرتا ہوں تم سب سے بھی اور ان سے
أَلَّا أَكُونَ بِدُعَاءِ رَبِّي	بھی جنہیں تم خدا کو چھوڑ کر پکارتے ہو اور
شَقِيًّا ۝ (مریم: ۴۷ - ۴۸)	میں تو پکاروں صرف اپنے پروردگار ہی کو

——— مجھے یقین ہے کہ میں اُس کو پکار کر بے نصیب نہ رہوں گا!

دربار میں پیشی ہوئی تو ؎

نہ لاؤ شو اس دل میں جو ہیں تیرے دیکھنے والے ۔ سرِ مقتل بھی دیکھیں گے چمن اندر چمن ساقی!

---

[1] إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا الخ (حٰمٓ السجدۃ: ۳۰)

کے مصداق خدائے واحد و قہار کے پرستار نے دنیوی شان و شوکت، جاہ و جلال اور دبدبے اور طنطنے کو ذرّہ بھر بھی خاطر میں نہ لاتے ہوئے شہنشاہِ وقت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اعلان کیا :

رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ (البقرۃ: ۲۵۸) — میرا رب وہ ہے جو جِلاتا ہے اور مارتا ہے !

اور جب ربوبیّت و اُلوہیّت کے مدّعی مغرور نے مناظرانہ رنگ میں کہا :

اَنَا اُحْیٖ وَاُمِیْتُ — مجھے بھی زندہ رکھنے یا مار دینے کا اختیار حاصل ہے !

تو پوری جرأتِ رندانہ اور شانِ بے باکانہ کے ساتھ تُرکی بہ تُرکی جواب دیا :

فَاِنَّ اللّٰہَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِھَا مِنَ الْمَغْرِبِ (البقرۃ: ۲۵۸) — تو اللہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تجھ میں کچھ اُلوہیّت ہے تو اُسے مغرب سے طلوع کر کے دکھا !

نتیجۃً اُس کافر مردود مسمّی نمرود کے پلّے سوائے مرعوبی و مبہوتی کے اور کچھ نہ رہا۔

اور پھر جب پوری قوم، پوری سوسائٹی، اور پورے نظامِ باطل نے اپنی شکست پر جھنجھلا کر اُسے آگ کے ایک بڑے الاؤ میں ڈالنے اور جلا کر راکھ کر دینے کا فیصلہ کیا تب بھی اس کے عزم اور ارادے میں کوئی تزلزل نہ آیا اور عشق کی اس بلند پروازی پر وہ عقل بھی انگشت بدنداں رہ گئی جس نے ابتداءً اسے خود ہی اس راہ پہ ڈالا تھا ؎

بے خطر کُود پڑا آتشِ نمرود میں عشق — عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی !

اور جب خدائے علیم و قدیر نے اسے آگ سے معجزانہ طور پر زندہ و سلامت نکال لیا تو اس نے یہ کہتے ہوئے کہ :

اِنِّیْ ذَاھِبٌ اِلٰی رَبِّیْ سَیَھْدِیْنِ (الصّٰفّٰت: ۹۹) — میں اپنے رب کی طرف ہجرت کر رہا ہوں۔ یقیناً وہ مجھے راہ یاب کرے گا !

گھر بار اور ملک و وطن سب کو خیرباد کہا اور آباء و اجداد کی سرزمین کو بحسرت و یاس

دیکھتا ہوا وہ اَن دیکھی منزل کی جانب روانہ ہوگیا تاکہ صرف خدائے واحد کی پرستش کر سکے اور محض اسی کے نام کا کلمہ پڑھ سکے! حالانکہ اب زندگی کے اس دَور کا آغاز ہو چکا تھا جس میں بدن کا زور ٹوٹتا سا محسوس ہونے لگتا ہے اور کہولت کے آثار شروع ہو جاتے ہیں! بقولِ حالی ؎

ضعفِ پیری بڑھ گیا، جوشِ جوانی گھٹ گیا ❊ اب عصا بنوائیے نخلِ تمنا کاٹ کر!

حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی ہجرت کے بعد کی پُوری زندگی مسلسل مسافرت و مہاجرت کی داستان ہے۔ آج شام میں ہیں تو کل مصر میں، پرسوں شرقِ اُردن میں ہیں تو اگلے روز حجاز میں، کوئی فکر ہے تو صرف اِس کی اور دُھن ہے تو محض یہ کہ توحید کا کلمہ سربلند ہو اور دعوتِ توحید کے لیے جا بجا مراکز قائم ہو جائیں۔ اپنی ان کوششوں میں وہ اس بوڑھے باغبان سے نہایت گہری مشابہت رکھتے ہیں جو جا بجا اپنے لیے نہیں بلکہ آنے والی نسلوں کے لیے باغ لگاتا پھر رہا ہو۔

جب بڑھاپے کے آثار کچھ زیادہ ہی طاری ہوتے محسوس ہوئے اور اِدھر یہ نظر آیا کہ اولاد سے تا حال محرومی ہے تو فکر دامنگیر ہوئی کہ میرے بعد اس مشن کو کون سنبھالے گا۔ وطن سے ایک بھتیجے نے ان کے ساتھ ہی ہجرت کی تھی جسے شرقِ اُردن میں دعوتِ توحید کی علمبرداری سونپ دی تھی۔ اللہ سے دعا کی "رَبِّ هَبْ لِيْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ" (الصّٰفّٰت: ۱۰۰) "پروردگار نیک وارث عطا فرما!" اور اللہ کی شان کہ خالص معجزانہ طور پر ستاسی برس کی عمر میں اللہ نے ایک چاند سا بیٹا عطا فرما دیا! اور وہ بھی ایسا جسے خود اللہ نے "غلامٌ حلیم" قرار دیا!۔

جیسے جیسے بیٹا بڑا ہوتا گیا گویا بوڑھے باپ کا تخلِ تمنا دوبارہ ہرا ہوتا گیا، یہ اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں کہ کیسی جذباتی وابستگی بوڑھے باپ کو اس بیٹے سے ہو گی اور کیسی اُمیدیں اس نے اپنے دل میں اس کے ساتھ وابستہ کر لی ہوں گی، بیٹا برابر کا ہونے کو آیا تو گویا باپ کا دست و بازو بن گیا اور دونوں نے مل کر توحید کے عظیم ترین مرکز یعنی کعبۃ اللہ کی دیواریں اٹھائیں جسے قرآن نے "البیتُ العتیق" بھی قرار دیا اور "اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ

لِلنَّاسِ" کا مصداق بھی!

یہ مُقدّس معمارانِ حرم جن جذبات کے ساتھ تعمیر کر رہے تھے اُن کی عکّاسی قرآنِ حکیم کی ان آیات میں بتمام و کمال کی گئی ہے:

وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ	اور جب ابراہیمؑ اور اسمٰعیل بیت اللہ کی
مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ ؕ رَبَّنَا	دیواریں اٹھا رہے تھے (تو کہتے جاتے تھے)
تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ	پروردگار ہمارے! قبول فرما ہم سے (ہماری
الْعَلِيْمُ ۝ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ	یہ خدمت) یقیناً تو سب کچھ سننے والا بھی ہے
لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً	اور سب کچھ جاننے والا بھی۔ اور اے رب
مُّسْلِمَةً لَّكَ ؕ	ہمارے بنائے رکھ ہم دونوں کو اپنا فرمانبردار
(البقرہ ۱۲۷-۱۲۸)	اٹھا ہماری اولاد میں سے اپنی ایک فرمانبردار اُمّت

ادھر بوڑھا باپ اپنے جوان ہوتے ہوئے بیٹے کو دیکھ دیکھ کر جی رہا تھا اُدھر قدرت مسکرا رہی تھی۔ اس کے ترکشِ امتحان میں ابھی ایک تیر باقی تھا۔ دل کو چھید جانے والا اور جگر سے پار ہو جانے والا تیر! گویا ابھی آخری آزمائش باقی تھی، محبّت اور جذبات کی آزمائش اور ایک امتحان باقی تھا، اُمّیدوں، آرزوؤں اور تمنّاؤں کا امتحان!

حکم ہُوا اپنے بیٹے کو قربان کر دو۔ زمین پر سکتہ طاری ہو گیا، آسمان لرز اُٹھا لیکن نہ بوڑھے باپ کے پائے ثبات میں کوئی لغزش پیدا ہوئی نہ نوجوان بیٹے کے صبر و تحمّل میں کوئی لرزش دونوں نے سرِ تسلیم خم کر دیا بقولِ سرمد:

سرمدؔ گلہ اختصار می باید کرد | یک کار ازیں دو کار می باید کرد
یا سر بہ رضائے دوست می باید داد | یا قطع نظر زیار ھم باید کرد

یہ دوسری بات ہے کہ عین آخری لمحے پر رحمتِ خداوندی حکمتِ امتحان پر غالب آ گئی اور بوڑھے باپ کی امتحان میں کامیابی کا اعلان کر دیا گیا بغیر اس کے کہ وہ اپنے اکلوتے بیٹے کا ذبح شدہ لاشہ فی الواقع اپنی آنکھوں سے دیکھے۔

سورۂ صٰفّٰت میں کتنے قلیل الفاظ میں صورتِ حال کی کتنی مکمّل تصویر کھینچ دی گئی

فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ؕ قَالَ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۫ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ ۝ وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰٓاِبْرٰهِيْمُ ۝ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ۚ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِيْنُ ۝

توجب وہ (بیٹا) اس (باپ) کے ساتھ بھاگ دوڑ کرنے کے قابل ہوا تو اُس نے کہا "میرے بچے! مَیں خواب میں دیکھ رہا ہوں کہ تمھیں ذبح کر رہا ہوں، تو تمھاری کیا رائے ہے؟" اُس نے جواب دیا "ابّا جان! کر گذریئے جو حکم آپ کو مل رہا ہے۔ آپ انشاء اللہ مجھے صابر پائیں گے" پھر جب دونوں نے سرِ تسلیم خم کر دیا اور اس نے اُسے پیشانی کے بل پچھاڑ دیا تو ہم نے پکارا "اے ابراہیم! (بس کر) تو نے خواب پورا کر دکھایا۔ ہم اچھی جزا دیا کرتے ہیں نیکوکاروں کو۔ یقیناً یہ ایک بہت بڑی آزمائش تھی!" (الصّٰفّٰت: ۱۰۲ تا ۱۰۶)

یا جس کا امتحان لیا جا رہا تھا اُس نے ہمّت نہ ہاری، ممتحن ہی کو بس کرنا پڑی جس نے نہ صرف یہ کہ اس وقت بیٹے کی جگہ مینڈھے کی قربانی بطورِ فدیہ قبول کر لی بلکہ اس کی دگار کے طور پر ہمیشہ ہمیش کے لیے قربانی کا سلسلہ جاری فرما دیا، بفحوائے الفاظِ قرآنی:

وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ ۝ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ۝ (الصّٰفّٰت: ۱۰۷-۱۰۸)

اور اس کے بدلے میں دی ہم نے ایک بڑی قربانی۔ اور پکّا رکھا ہم نے اُس پر (چلن) پچھلوں میں!

اس طرح امتحان اور آزمائش کی ایک طویل داستان کمال کو پہنچی اور عقل و فطرت کی سلامتی اور سیرت و کردار کی پختگی کی کٹھن جانچ پرکھ اور جذبات و احساسات کے ایثار اور محبّت کی قربانی کے مشکل امتحانات سے گذر کر اللہ کا ایک بندہ ایک طرف ملّتِ الٰہی کی خلعت سے سرفراز ہُوا اور دوسری طرف امامتُ النّاس کے منصب پر فائز ہوا۔

سَلٰمٌ عَلٰٓی اِبْرٰهِیْمَ ۝ كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ۝ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِیْنَ ۝

سلام ہو ابراہیم پر! اسی طرح ہم بدلہ دیتے ہیں نیکوکاروں کو، یقیناً وہ ہمارے صاحب یقین بندوں میں سے تھا۔

اور بقول علّامہ اقبال

چوں می گویم مسلمانم، بلرزم — کہ دانم مشکلاتِ لَا اِلٰہ را

گویا یہ ہے ایک سچّے مسلمان کی زندگی کی کامل تصویر اور 'ایمانِ حقیقی' کی صحیح تعبیر بقول مولانا محمد علی جوہر ؎

یہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے — لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

سورۂ حجّ میں حج کے دو ہی بنیادی ارکان کا ذکر ہے: ایک اللہ کے نام پر جانوروں کی قربانی اور دوسرے طوافِ بیتُ اللہ اور ان میں سے بھی زیادہ زور اور تکرار و اصرار قربانی ہی پر ہے بفحوائے آیاتِ مندرجۂ ذیل:

۱۔ وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ یَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰی كُلِّ ضَامِرٍ یَّاْتِیْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ ۝ لِّیَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَیَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِیْٓ اَیَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰی مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِیْمَةِ الْاَنْعَامِ ۚ فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِیْرَ ۝ ثُمَّ لْیَقْضُوْا تَفَثَهُمْ وَلْیُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ وَلْیَطَّوَّفُوْا بِالْبَیْتِ الْعَتِیْقِ ۝ (الحجّ: ۲۷ تا ۲۹)

اور صدا لگا لوگوں میں حج کے لیے، کہ آئیں تیرے پاس پاپیادہ یا دُور دراز سے گہری وادیوں میں سے ہوکر آنے والے دُبلے اونٹوں پر۔ تاکہ حاضر ہوں اپنے منافع کے مقامات پر اور لیں اللہ کا نام معیّن دنوں میں، ان جانوروں کو ذبح کرتے ہوئے جو ہم نے اُن کو دیئے ہیں۔ پھر کھاؤ ان میں سے خود بھی اور کھلاؤ بے کسوں اور محتاجوں کو بھی۔ پھر وہ دُور کریں اپنا میل کچیل، اور پُوری کریں اپنی نذریں اور چکّر لگائیں ہمارے قدیم گھر کا!

۲۔ وَلِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا

اور ہر اُمّت کے لیے مقرّر کر دیا ہے ہم نے

؎ حج کے نفسِ مناسک کا تفصیلی بیان سورۃ البقرۃ کی آیات ۱۹۶ تا ۲۰۳ میں ہے!

لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ؕ (الحج: ۳۴)

قربانی کا سلسلہ، تاکہ لیں نام اللہ کا ان چوپایوں کو ذبح کرتے ہوئے جو عطا کئے ہیں ہم نے ان کو۔

۳۶۔ وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ ۖ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ ۚ فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ ؕ كَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ (الحج: ۳۶)

اور کعبے کی نذر کے اُونٹوں کو ہم نے تمہارے لیے اللہ کے شعائر میں سے ٹھہرایا ہے۔ اس میں تمہارے لئے بھلائی ہے، سو لو نام ان پر اللہ کا ان کو قطار میں کھڑا کر کے پھر جب گر جائیں وہ کروٹ کے بل تو کھاؤ ان میں سے خود بھی اور کھلاؤ صابروں اور بے قراروں کو بھی! اسی طرح ہم نے دے دیا ہے اُن کو تمہارے بس میں تاکہ تم شکر کرو اللہ کا!

ان میں سے جہاں تک طوافِ بیت اللہ کا تعلق ہے ظاہر ہے کہ وہ تو صرف مکہ مکرمہ ہی میں ادا کیا جا سکتا ہے۔ البتہ قربانی کو عید الاضحی کی صورت میں رُوئے زمین کے ان تمام لوگوں کے لیے عام کر دیا گیا جو اللہ کی اطاعت و فرمانبرداری کی راہ اختیار کر کے گویا ابراہیمؑ ہی کی معنوی ذُرّیّت میں شامل ہو گئے ہیں۔ قطع نظر اس سے کہ اُن کا کوئی صلبی و نسلی تعلق ان سے ہے یا نہیں۔ چنانچہ ایک روایت کی رُو سے جسے زید ابن ارقم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے امام احمد ابن حنبل اور امام ابن ماجہ رحمہما اللہ نے اپنی اپنی مسند میں نقل کیا ہے، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ "یا رسول اللہ! ان قربانیوں کی نوعیت کیا ہے؟" تو جواباً آپؐ نے ارشاد فرمایا: "یہ تمہارے باپ ابراہیمؑ کی سُنّت ہے!" ——— گویا بھیڑوں، بکریوں، گایوں اور اونٹوں کی قربانی اصلاً علامت کی حیثیت رکھتی ہے اطاعت و فرمانبرداری اور تسلیم و انقیاد اور اس پر مداومت و استقامت کی اس رُوح کے لیے جو حضرت ابراہیم علیٰ نبیّنا و علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کی پوری شخصیت میں رچی بسی ہوئی تھی اور ان کی پوری زندگی میں جاری و ساری رہی تھی۔

یہی وجہ ہے کہ قرآنِ حکیم میں متذکرہ بالا آیات کے متصلاً بعد ہی متنبہ فرما دیا گیا تھا کہ:

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا	اللہ تک نہیں پہنچتا ان قربانیوں کا گوشت
دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى	یا خون ——— ہاں اُس تک رسائی ہے
مِنْكُمْ (الحج - ۳۷)	تمہارے تقویٰ کی!

یہ دوسری بات ہے کہ جس طرح ہم نے دین کے دوسرے تمام حقائق کو محض رسموں میں تبدیل کر کے رکھ دیا ہے۔ جس کا مرثیہ کہا ہے علامہ اقبالؒ نے اس شعر میں کہ ؎

رہ گئی رسمِ اذاں روحِ بلالیؓ نہ رہی — فلسفہ رہ گیا تلقینِ غزالیؒ نہ رہی!

اسی طرح قربانی کی روح بھی آج نام نہاد مسلمانوں کی ایک عظیم اکثریت کے عمل ہی سے نہیں وہم و خیال سے بھی غائب ہو چکی ہے اور اب اس کی حیثیت بعض کے نزدیک محض ایک رسم کی ہے اور اکثر کے نزدیک اس سے بھی بڑھ کر صرف ایک قومی تہوار کی یہی وجہ ہے کہ اگرچہ ہر سال پندرہ لاکھ سے بھی زائد کلمہ گو حج کرتے ہیں اور بلا مبالغہ کروڑوں کی تعداد میں جانوروں کی قربانی دی جاتی ہے لیکن وہ روحِ تقویٰ کہیں نظر نہیں آتی جس کی رسائی اللہ تک ہے! بقول علامہ اقبال مرحوم

رگوں میں وہ لہو باقی نہیں ہے	وہ دل، وہ آرزو باقی نہیں ہے
نماز و روزہ و قربانی و حج	یہ سب باقی ہیں، تو باقی نہیں ہے

کاش کہ ہم جرأت کے ساتھ موجودہ صورتِ حال کا صحیح تجزیہ کر سکیں اور اصل روحِ قربانی کو اپنی شخصیتوں میں جذب کرنے پر کمرِ ہمت کس لیں، اور عیدِ قربان پر جب اللہ کے لیے ایک بکرا یا دنبہ ذبح کریں تو ساتھ ہی عزمِ مصمم کر لیں کہ اپنا تن من، دھن اُسی کی رضا پر قربان کر دیں گے ——— گویا بقولِ شاعر ؏

"میرا سب کچھ مرے خدا کا ہے!"

اور بفحوائے الفاظِ قرآنی:

اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ لَا شَرِیْكَ لَهٗ ۚ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ۝

مولانا مظہر وصی صاحب ندوی

سیرۃ نبویؐ، قرآن کریم کی روشنی میں

(۱)

فترۃ الوحی اور اس کے بعد

فترۃ الوحی کی حکمت | نبوّت کی ابتدا میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت کے لئے اور بعض دیگر مصلحتوں کی وجہ سے ایک "فترۃ الوحی" یعنی نزول وحی میں وقفہ کا دور بھی آیا تھا۔ اس وقفہ میں جو مصلحتیں تھیں ان کو صحیح طور پر تو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے لیکن بظاہر اس کا ایک مقصد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلی وحی کے بعد جو پریشانی لاحق ہو گئی تھی اس کو کم کرنا، مزید وحی کی طلب پیدا کرنا اور اس کو قبول کرنے کے لئے ضروری قوتِ برداشت پیدا کرنا تھا۔ دوسرا مقصد یہ تھا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی سمجھ لیں اور دنیا بھی یہ جان لے کہ وحی اختیاری شے نہیں ہے بلکہ اس کی آمد سراسر ارادۂ الٰہی کی تابع ہے ۔

بہرحال مقصد جو بھی ہو اس وقفہ کے دوران آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت اضطراب ہو گیا تھا۔ آپ کو رہ رہ کر یہ خیال آتا تھا کہ کہیں مجھ سے کوئی ایسی بات تو سرزد نہیں ہو گئی ہے، جو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کی موجب ہو اور جس کی وجہ سے وحی کا سلسلہ منقطع ہو گیا ہو۔ پھر مخالفین بھی اگرچہ اس وقت تک بہت کھل کر سامنے نہیں آئے تھے لیکن جو بھی تھے ان کو باتیں بنانے کا موقعہ مل گیا تھا۔ چنانچہ بعض روایات میں آتا ہے کہ وہ کہنے لگے تھے کہ (نعوذ باللہ) اس شخص کا شیطان جو اس کو اُلٹی سیدھی باتیں سکھایا کرتا تھا اُس نے اِس کو چھوڑ دیا ہے۔

فترۃ الوحی کا خاتمہ | اس صورتِ حال کا خاتمہ سورۂ ضحیٰ کے نزول سے ہوا۔ اس سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے کائنات کے اندر روزانہ رُونما ہونے والے ایک عام مشاہدہ کی طرف توجّہ دلاتے ہوئے فرمایا کہ دیکھو یہاں کبھی روشن دن ہوتا ہے تو کبھی تاریک رات چھا جاتی ہے۔ وہ لوگ بہت ہی نادان ہوں گے جو یہ سمجھ بیٹھیں

کہ دن کی روشنی تو انسان کے لئے نعمت ہے لیکن رات کی تاریکی مصیبت۔ بلکہ حقیقتاً خالقِ کائنات کی حکمت کے تحت یہ دونوں حالتیں سراسر رحمت ہیں۔ دن کی روشنی میں انسان اگر سرگرمِ عمل رہتا ہے تو رات کی تاریکی اس کے واسطے دوسرے دن پھر سے سرگرمِ عمل ہو جانے کی قوت فراہم کرتی ہے۔

اسی طرح بندوں پر اکرام و انعام اور اُن کی نصرت و تائید اگر ان کی حوصلہ افزائی کے لئے ہیں تو مشکلات اور موانع، مصائب اور آزمائشیں ان کی مخفی قوتوں اور خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کرنے کا ذریعہ ہیں۔ پھر اس سورۃ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبل نبوت زندگی کے مختلف مرحلوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ ان مرحلوں میں کس طرح اللہ تعالیٰ کی خاص رحمتیں آپ کے شاملِ حال رہی ہیں۔ اور ان دونوں باتوں سے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ہر آنے والا مرحلہ پہلے مرحلے سے بہتر ہوگا۔ اور پھر یہ بشارت دی گئی ہے کہ ہم آپ کو اتنا دیں گے، اتنا دیں گے کہ آپ راضی ہو جائیں گے۔

سورۂ ضحیٰ کی ان آیات مبارکہ پر براہِ راست ایک نظر ڈال لینا مناسب ہوگا۔

وَالضُّحٰى وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى۔ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى ۝ فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ۝

(قسم ہے روزِ روشن کی اور (قسم ہے) رات کی جب کہ وہ چھا جائے۔ (اے نبی!) تمہارے ربّ نے نہ تم کو چھوڑا ہے۔ اور نہ وہ تم سے بیزار ہوا ہے۔ اور یقیناً تمھارے لئے بعد کا دور پہلے دور سے بہتر ہے اور جلد ہی تمہارا ربّ تم کو اتنا دے گا کہ تم (خود) راضی ہو جاؤ گے! (کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ) تمھارے ربّ نے تم کو حالت۔ یتیمی میں پایا تو اس نے تم کو (بیکسی میں مبتلا ہونے سے بچا کر) پناہ دی اور اس نے تم کو سیدھا راستہ تلاش کرتے ہوئے پایا تو اُس نے تم کو راہ دکھا دی، اور اس نے تم کو

تنگ دست پایا تو اس نے تم کو غنی بنا دیا۔ لہٰذا (اب تم) یتیم (بے سہارا اور بے بس) کو دبا ؤ نہیں اور (حق کا) سوال کرنے والے کو ڈانٹو نہیں اور اپنے رب کے انعام کا چرچا کرو!

اس سورۃ میں اور قرآن مجید کے دیگر مقامات پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبل از نبوت زندگی کے بارے میں جو اشارات کئے گئے ہیں ان پر ایک علیحدہ مجلس میں گفتگو مناسب ہوگی۔ یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ ابتداءِ نبوت میں وحی کے رُک جانے سے حضورؐ کو جو پریشانی لائق ہوگئی تھی وہ اس سورۃ کے نزول سے دور ہوگئی اور اللہ تعالیٰ کی بشارتوں کے ساتھ آپ دعوتِ حق پہنچانے میں اور زیادہ سرگرم عمل ہوگئے۔

مکمل قرآن مجید یکبارگی نازل نہ کرنے کی مصلحت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آئندہ زندگی میں مخالفتوں کے جو طوفان برپا ہوئے اور دشمنوں نے آپ کو ایذا پہنچانے کے لئے جو جو وسیلے اور طریقے اختیار کئے ان میں یہی وحیٔ الٰہی کا نزول آنحضرت کے حوصلوں کو بڑھاتا تھا، اور آپ کے مجروح دل پر تسلی اور اطمینان کا خنک مرہم رکھتا تھا۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚ كَذٰلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ ۔ (اور انہوں نے "یعنی معترضین نے" کہا کہ قرآن ان کے اوپر ایک ہی دفعہ میں پورے کا پورا کیوں نازل نہیں کر دیا گیا۔ (ہاں)، ایسا ہی ہوا (یعنی قرآن مجید تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہوا) تاکہ ہم اس کے ذریعہ سے تمہارے دل کو جما دیں۔!)

وحی کا یہ وقفہ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت پر مخالفتوں اور مزاحمتوں کا اثر انداز ہونا اور پھر وحی کے ذریعہ آپ کی تسلی اور اطمینان کا اہتمام کیا جانا قرآن مجید کے کلامِ الٰہی ہونے کی بے شمار داخلی شہادتوں میں ایک عظیم شہادت ہے۔ کیونکہ اگر کلام آدمی کا اپنا ہو تو وہ جب چاہے اس جیسا کلام بیٹھے بٹھائے وقفہ ہونا اور وقفہ سے پریشانی پیدا ہونا کیا معنی۔ اسی طرح کوئی شخص خود اپنے کلام میں اپنی کمزوریوں کو بیان کرنا بھلا کب پسند کر سکتا ہے۔ اس سے معلوم

ہو اکہ قرآن کلام الٰہی ہے۔ یہ حضورِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کا اپنا کلام نہیں ہو سکتا ——— !!

سورۂ انشراح | حضرت عبداللہ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ سورۂ ضحیٰ کے بعد ہی سورۂ انشراح نازل ہوئی۔ اس سورۃ کا مضمون بھی سورۂ ضحیٰ جیسا ہی ہے۔ یعنی یہ کہ اپنی زندگی میں اللہ تعالیٰ کے جن انعامات کا مشاہدہ کرتے چلے آتے تھے۔ ان کو آئندہ کی کامیابیوں اور کامرانیوں کی بشارت کے لئے بطورِ دلیل پیش کیا گیا ہے۔

سورۂ انشراح میں ایک عجیب بات یہ ہے کہ حضورِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کو آنے والی زندگی میں جو کامیابی ہونے والی تھی اس کا ذکر ماضی کے صیغے میں کیا گیا ہے۔ یعنی وہ کامیابی ایسی یقینی ہے کہ جیسے وہ دولت حاصل ہو چکی ہو۔ پھر قیامت تک آپ کے ذکر کو بلند کرتے چلے جانے کا ذکر بھی اسی طرح ماضی کے صیغے میں کیا گیا ہے۔ حالانکہ یہ دراصل اللہ تعالیٰ کی جانب سے ایک وعدہ تھا۔ لیکن جس شان کے ساتھ یہ وعدہ پورا ہُوا وہ قرآن مجید کا ایک اور معجزہ ہے۔

یُسر اور عُسر کا دائمی رابطہ | سورۂ انشراح کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے اپنی ایک سنّت کو واضح کیا ہے اور اس سُنّت کے ناقابلِ تغیر ہونے کو ظاہر کرنے کے لئے ایک ہی جملے کو دوبارہ دُہرایا ہے: اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا۔ یعنی آسانی اور فراخی کا دامن ہمیشہ تنگی اور تکالیف کے ساتھ بندھا ہوا ہے۔ اِس سُنّت کو بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اگرچہ کامیابی اور کامرانی کا وعدہ ہم نے کیا ہے۔ لیکن اس وعدہ کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم محنت و مشقت اور سعی و جہد کو چھوڑ بیٹھو اور کامیابی اور کامرانی خود بخود تمہارے قدم چوم لے۔ نہیں ایسا ہرگز نہیں ہوگا، ہماری سُنّت اور ہمارا قانون یہ ہے کہ محنت کروگے تو اس کا پھل ملے گا۔

اُمّت کے لئے سبق | بظاہر اس آیت کا خطاب نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم سے ہے۔ لیکن دراصل اس کے ذریعہ سے آپ کی اُمّت کو یہ بتانا مقصود ہے کہ جب ہم نے اپنے پیارے نبی کی کامیابی کے لئے طائف کی گلیوں میں سنگ باری

سے گزرنا، مکّے کی پہاڑیوں میں قید رہنا، اُحد کے میدان میں فوج کے انتشار اور زخموں کے غم سہنا، ہجرت کرنا اور جہاد و قتال کرنا ضروری قرار دیا ہے، تو تم کبھی اس خام خیالی میں مبتلا نہ ہونا کہ محنت اور مشقّت کے بغیر دنیا میں اپنے دشمنوں پر فتح پا جاؤ گے یا جنّت میں داخل کر دیئے جاؤ گے، نہیں ایسا ہرگز نہ ہوگا۔ حضورِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے کیا خوب فرمایا ہے:

الا ان سلعۃ اللہ غالیۃ الا ان سلعۃ اللہ الجنّۃ

(سُنو! اللہ کا سودا بہت گران ہے، سُنو! اللہ کا سودا جنّت ہے، جنّت ——— !!

کاش! ہم اس حقیقت کو سمجھ لیں اور خوش فہمیوں سے نکل کر جہاد و مجاہدے کے لئے تیار ہو جائیں!

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○

(۲)

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی سیرت قبل نبوّت

قرآنِ حکیم کی روشنی میں سیرتِ طیبہ کے اس مطالعہ میں آگے بڑھنے سے قبل ان اشارات پر بھی ہم ذرا نظر ڈالتے چلیں جو آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی نبوّت سے پہلے کی زندگی کے بارے قرآن مجید میں موجود ہیں۔ قرآنِ حکیم میں حضورِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی نبوّت سے پہلے کی پوری زندگی کو جس طرح محض ایک لفظ "المدّثّر" کے ذریعہ واضح کیا گیا ہے، اس کا ذکر پہلے حلقے میں ہو چکا ہے۔ اب ہم بعض ان اشارات کی وضاحت کریں گے جو آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی اس زندگی کے بعض دیگر پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں:

آنحضرتؐ کی معروف شخصیّت اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَقَدْ جَآءَکُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ (تمہارے پاس ایک رسول آچکا ہے، جو خود تم ہی میں سے ہے!) اس آیت سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ حضورِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم اچانک کہیں باہر سے آکر تبلیغ نہیں کرنے لگے تھے

کہ لوگوں کو آپؐ کی سابقہ زندگی کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو کہ وہ کیا تھی اور کیسی تھی، نہ آپؐ کے بارے میں یہ فیصلہ کیا جا سکتا ہو کہ آپؐ کی بات مانی جائے یا نہ مانی جائے۔ ؎

حضرت جعفرؓ ابن ابی طالب نے نجاشی کے دربار میں اسلام کی دعوت کا تعارف کراتے ہوئے جو تقریر کی تھی، اُس میں اِسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ہماری طرف ایسی ہستی کو رسول بنا کر بھیجا ہے جس کو ہم پہچانتے ہیں اور جس کے خاندان سے بھی ہم واقف ہیں ؎

پھر اسی دلیل نبوّت کی طرف اللہ تعالیٰ نے زیادہ واضح الفاظ میں متوجہ کرتے ہوئے حضورؐ کی زبانِ مبارک سے کہلوایا :

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝

(اس (دعوت) سے قبل میں تمھارے اندر رہتے ہوئے ایک عمر گزار چکا ہوں، تو کیا تم سمجھتے نہیں ہو!)

مطلب یہ ہے کہ کیا میری سابقہ زندگی جو تمھاری آنکھوں کے سامنے گزری ہے اس بات کا جواز پیدا کرتی ہے کہ میں اب چالیس سال کی عمر میں پہنچ کر جھوٹے جھوٹے دعوے کرنا شروع کر دوں گا؟

آیت : لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ سے دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تمھاری جنس میں سے ہیں اس لئے آپ کی زندگی تمھارے واسطے نمونہ اور حُجّت ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے : لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ط

آنحضرتؐ کا اُمّی ہونا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جو زندگی نبوّت سے پہلے گزری تھی اُس کے بارے میں ایک اور بات جس کو قرآن مجید وضاحت سے بیان کرتا ہے، وہ یہ ہے کہ آپؐ اُمّی ہیں۔ یعنی لکھنا پڑھنا سرے سے نہیں جانتے ہیں، چنانچہ ارشاد ہے : الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ (یعنی جو پیروی کرتے ہیں اس اُمّی رسول و نبی کی ..... ایک اور مقام پر ارشاد ہے : هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ (یعنی وہی ہے جس نے

اُمّی قوم کے اندر اُنہی میں سے ایک رسول بھیجا!) — پھر آپؐ کے اُمّی ہونے سے قرآن یہ حقیقت ثابت کرتا ہے کہ اب چالیس سال کی عمر میں آپؐ علم و حکمت سے لبریز گزشتہ اُمّتوں کی تاریخ و حوادث پر مشتمل اہلِ کتاب کی غلط بیانیوں کی تصحیح کرنے والی یہ کتاب جو پڑھ کر سُنا رہے ہیں، وہ سراسر علمِ الٰہی پر مبنی ہے۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اِن حقائق کے جاننے اور اُن تک رسائی حاصل کرنے کے لئے وحیٔ الٰہی کے سوا اور کوئی وسیلہ موجود ہی نہیں:

مَا كُنْتَ تَدْرِیْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِیْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِیْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا (اے نبی!) تم نہ جانتے تھے کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کسے کہتے ہیں۔ لیکن یہ تو ہم ہیں کہ ہم نے اس کو نور بنا کر اتارا کہ اس کے ذریعہ سے اپنے بندوں میں سے جس کو چاہیں ہدایت بخش دیں!)

• مزید کھول کر یوں ارشاد فرمایا:

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِیَمِیْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ۝ (یعنی نہ تو آپ اس سے قبل کوئی کتاب پڑھا کرتے تھے نہ اپنے دائیں ہاتھ سے لکھا کرتے تھے۔ (اگر ایسا ہوتا) تب تو ان باطل پرستوں کے شک میں پڑنے کے لئے کوئی وجہ جواز ہوتی!)

بلکہ قرآن مجید تو یہاں تک کہتا ہے کہ:

وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰی (یعنی) اُس نے تم کو راستہ تلاش کرنے میں سرگرداں پایا تو اُس نے تمہاری ہدایت کا انتظام کر دیا!)

آنحضرتؐ کی یتیمی | قرآن مجید سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے اپنا بچپن یتیمی میں گزارا۔ بچّے کے لئے عام طور پر یتیمی دُکھوں اور تکلیفوں کے علاوہ بُری تربیت اور غلط نشو و نما کا سبب بن جاتی ہے۔ لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت آپؐ کے شاملِ حال تھی، اس لئے یتیمی آپؐ کی شخصیت کے نشو و نما پر کوئی بُرا اثر نہ ڈال سکی۔ بلکہ اس سے آپؐ نے بے کسوں اور بے بسوں پر شفقت کرنے کا سبق سیکھا، اور حتی الوسع خود اپنی ذات پر اعتماد کی عادت ڈالی اور

دوسروں پہ بوجھ بننے کو سخت ناپسند فرمایا ؛

آنحضرتؐ کی معاشی حالت | قرآن مجید سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کی زندگی دولت مندی کی زندگی نہ تھی، بلکہ آپ ضرورت مند تھے۔ سیرت کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کے والد ماجد نے ترکہ میں صرف ایک اونٹ اور ایک لونڈی چھوڑی تھی۔ لیکن اس ضرورت مندی کے باعث نہ آپؐ میں کم ہمتی پیدا ہوئی نہ جائز اور ناجائز دولت سمیٹنے کی حرص نے نشوونما پائی۔ نہ آپؐ نے دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانے کو گوارا کیا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے خود اپنے کرم سے آپؐ کو غنی بنا دیا۔ آپؐ سب سے بے نیاز ہو کر صرف اپنے ربّ کی رحمت کے طالب تھے : وَوَجَدَكَ عَائِلًا فَأَغْنَىٰ (اور اُس نے تم کو ضرورت مند پایا تو اسی نے تم کو (سب سے) بے نیاز کر دیا!)

آنحضرتؐ کا خُلقِ عظیم | آخر میں قرآن مجید کی وہ عظیم شہادت ہمارے سامنے آتی ہے جس کو آپؐ کے سخت ترین دشمنوں نے بھی کبھی جھٹلانے کی جرأت نہ کی وہ شہادت ہے : وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ ؕ (اور یقیناً تم (اے محمدؐ!) اخلاق کے ایک عظیم مرتبہ پر فائز ہو!) - یہ شہادت سورۂ قلم میں دی گئی ہے جو مکہ میں نازل ہونے والی ابتدائی سورتوں میں سے ہے۔ اس شہادت کی اہمیت کو آپؐ اس طرح سمجھ سکتے ہیں کہ اگر کوئی شخص آپ کے ساتھ عناد میں مبتلا ہو جائے تو وہ آپ کی حقیقی خوبیوں کو بھی کبھی تسلیم نہ کرے گا۔ لیکن اہلِ مکہ میں سے کسی بڑے سے بڑے دشمن کو بھی یہ جرأت نہ ہو سکی کہ وہ قرآن مجید کی اس شہادت کو جھٹلائے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلقِ عظیم کا انکار تو کجا اس میں کسی نقص کی نشان دہی کر سکے۔

یہ خلقِ عظیم جس کی شہادت قرآن مجید نے دی ہے، وہی ہے جس کے بعض پہلوؤں کی جانب اشارہ کر کے حضرت خدیجۃ الکبریٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نبیِ برحق اور تائیدِ الٰہی کے مستحق ہونے پر اس طرح استدلال کیا تھا:

اَبْشِرْ فوالله - انّ الله لن يخزيك ابدًا فانّك لتصل الرحم وتقول الحق وفي رواية وتؤدّي الامانة وتحمل الكلّ وَ

تکسب المعدم و تقری الضیف و تعین فی نوائب الحق۔

(آپ خوش ہو جائیے، خدا کی قسم بیشک اللہ آپ کو ہرگز رسوا نہ کرے گا کیونکہ آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، سچی بات کہتے ہیں، امانتیں ادا کرتے ہیں، بے سہارا لوگوں کو سہارا دیتے ہیں، نادار لوگوں کو کما کر کھلاتے ہیں، مہمان نوازی کرتے ہیں اور سچائی کے راستے میں پیش آنے والی مصیبتوں میں آدمی کی مدد کرتے ہیں)۔ اِس خلقِ عظیم کی شہادت حجرِ اسود کو اس کی جگہ پر رکھنے میں پیدا ہونے والے جھگڑے کا فیصلہ حضورؐ پر چھوڑتے ہوئے کفار نے دی تھی اور اسی کی شہادت کوہِ صفا کے دامن میں جمع ہونے والے مکہ کے سب سے بڑے اجتماع نے دی تھی۔

(۳)

عام دعوت کا آغاز

تین سال تک خاموشی کے ساتھ انفرادی رابطے کے ذریعے دعوت پہنچانے کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ پچاس سے زائد جرأت مند صاحبِ شعور نوجوان دعوتِ اسلامی کو قبول کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہو چکے تھے۔ چونکہ یہ ایمان لانے والے قریش کے تقریباً ہر خاندان میں سے نکل کر آئے تھے۔ اِس لئے اس بات کا کوئی اندیشہ نہیں رہا تھا کہ اِس دعوت کو اب کوئی شخص طاقت کے ذریعے اچانک ختم کر سکتا ہے۔ ان نوجوانوں کے خلاف طاقت کے استعمال کرنے کا نتیجہ یہ نکلتا کہ قریش کے ہر خانوادہ میں تصادم اور خانہ جنگی شروع ہو جاتی۔ چنانچہ اب دعوت کو خفیہ رکھنے کی ضرورت باقی نہ رہی تھی۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ مکہ کی چھوٹی سی بستی کے پچاس ساٹھ کے قریب لوگوں کا اس دعوت میں شامل ہو جانا ایسی بات نہ تھی جو چھپی رہ سکتی۔ اس لئے قریش کو عام طور پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا علم پہلے ہی ہو چکا تھا، مگر وہ ابھی تک اس کو نظر انداز کر دینے کا رویہ اپنائے ہوئے تھے۔

عام دعوت کا اُسلوب | اِن حالات میں اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ صرف کھلم کھلا دعوت پیش کرنے کی ہدایت فرمائی بلکہ شدید جارحانہ انداز اپنانے کا حکم دیا۔ چنانچہ اس نئے مرحلے کا آغاز اِس آیت مبارکہ سے ہوا

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ اِنَّا كَفَيْنٰكَ

الْمُسْتَهْزِئِيْنَ الَّذِيْنَ يَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ۝ (پس (اے نبی)، ہانکے پکارے کہہ دیجئے وہ بات جس کا آپ کو حکم دیا جا رہا ہے۔ اور مشرکین سے بے رُخی اختیار کر لیجئے۔ اُن مذاق اڑانے والوں کی تمھاری طرف سے خبر لینے کے لئے ہم کافی ہیں جو اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو پکارتے ہیں، تو اُن کو جلد ہی (اپنے غلط رویہ کا نتیجہ) معلوم ہو جائے گا۔

صاحبِ خُلقِ عظیم کے لئے ایک دشوار مرحلہ | حضور صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے لئے اللہ تعالیٰ کی اِس ہدایت پر عمل کرنا بظاہر بڑا مشکل کام معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اب آپؐ اپنی عمر کی پانچویں دہائی میں پہنچ چکے تھے۔ اِس طویل عرصے میں آپؐ کسی کے ساتھ تلخ کلامی تک کے روادار نہ ہوئے تھے، تصادم یا جھگڑا تو دُور کی بات ہے۔ لیکن اب دعوتِ دین کی مصلحت کا تقاضا یہی تھا کہ مشرکین کے غلط عقائد اور بُرے اعمال پر انتہائی سخت لب و لہجہ میں تنقید کی جائے تاکہ نسبتاً زیادہ غفلت میں مبتلا لیکن حق پسند لوگ بیدار ہوں، اس دعوت کو سُنیں اور اس کو قبول کریں۔ پھر تلخ لب و لہجہ اور خود اصل دعوت کا نتیجہ یہی نکلنا تھا کہ وہ معاشرہ جو اب تک بحیثیتِ مجموعی نظر انداز کر دینے کی پالیسی پر عمل پیرا تھا، اب دعوت کو کچلنے پر تل جائے۔ اِس طرح حق و باطل میں تصادم کا آغاز ہو جائے، اور تصادم کے نتیجے میں نہ صرف مکّہ بلکہ پورے عرب میں اِس دعوت کا چرچا ہو جائے اور ہر جگہ کے حق پسند اور سمجھدار لوگ اس دعوت کو سمجھ کر اسے قبول کرنے کے لئے آگے بڑھیں ۞

تصادم وسیلۂ تربیت | اس تصادم کے نتیجے میں ان اہل ایمان کی مزید تربیت بھی ہوتی چلی جائے جو آبائی دین کو چھوڑ کر اور اپنے شعوری فیصلے کے تحت اس دین میں داخل ہوئے تھے، اور جن کے ایمان کی پختگی کے لئے نماز، تعلیمِ قرآن اور قیام اللّیل سے اب تک کافی کام لیا جا چکا تھا۔ عملی میدان کی یہ تربیت، خانقاہی تربیت سے قطعاً مختلف نوعیت کی تھی۔ یہ شیشہ کاری اور مینا کاری کا فن نہ تھا۔ بلکہ ایک آزمائش کے بعد اُس سے سخت تر آزمائش میں ڈال کر ایسے مضبوط عزم اور حوصلے کے انسان تیار کئے جانے تھے، جو خارا شگافی کے طریقوں سے آشنا ہوں ۞

اِن ساری مصلحتوں کی وجہ سے تصادم ناگزیر تھا اور تصادم کے لئے ضروری

تھا کہ محمد رسول اللہ جیسی مرنجاں مرنج ہستی وہ لب و لہجہ اختیار کرے کہ جس سے غفلت کی نیند میں سرگشتہ انسان بیدار ہو جائیں، اور دعوت کو نظر انداز کرنے والے اس کو ختم کرنے کے لئے ظلم و تشدد کے ہتھیار سنبھال لیں ؛

چنانچہ یہی وہ دور ہے جس میں پہلے قریش کے وفود پے در پے جناب ابوطالب کے پاس آئے اور اُن سے نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کی سخت تنقیدوں کی شکایت کر کے اُن کو اس تنقید سے باز رکھنے کا مطالبہ کیا ؛

ان وفود نے جن الفاظ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی تنقید کی شکایت کی ہے، ان سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تنقید کے لب و لہجہ کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔ انہوں نے ایک موقعہ پہ حضرت ابوطالب سے کہا :

یا ابا طالب ان ابن اخیك قد سب آلھتنا وعاب دیننا و سفّہ احلامنا وضلل آباءنا فاما تکفّہ عنا واما ان تخلّیٰ بیننا و بینہ۔ (اے ابوطالب ! آپ کا بھتیجا ہمارے معبودوں کو گالیاں دیتا ہے، ہمارے دین میں کیڑے نکالتا ہے، ہم کو احمق قرار دیتا ہے اور ہمارے بزرگوں کو گمراہ ٹھہراتا ہے، اس لئے یا تو آپ اپنے بھتیجے کو ان باتوں سے روکیں آپ ہمارے درمیان سے ہٹ جائیں !)

ابوطالب نے اس وفد کو تو حکمت عملی اور حُسنِ گفتار سے ٹال دیا لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تنقید میں نرمی آنے کے بجائے اور شدت پیدا ہوتی چلی گئی۔ چنانچہ دوبارہ پھر ایک وفد ابوطالب کے پاس آیا، اُس نے ابوطالب سے کہا :

انا استنھیناك من ابن اخیك فلم تنھہ عنا وانا واللہ لا نصبر علی ھذا من شتم آباءنا وتسفیہ احلامنا وعیب آلھتنا حتی تکفہ عنا او ننازلہ وایاك فی ذلك حتی یھلك احد الفریقین۔ (ہم نے آپ سے کہا تھا کہ آپ اپنے بھتیجے کو روکیں لیکن آپ نے اس کو نہ روکا۔ خدا کی قسم ہم ٹھنڈے پیٹوں یہ برداشت نہ کر سکیں گے کہ ہمارے آباء و اجداد کو گالیاں دی جائیں، ہم کو احمق ٹھہرایا جائے۔ اور ہمارے معبودوں میں کیڑے نکالے جائیں۔ یا تو آپ اس کو ان باتوں سے

باز رکھیں ورنہ ہم اس کے اور آپ کے مقابلے پر اُتر آئیں گے تا آنکہ یہ جنگ کسی ایک فریق کی تباہی پر ہی ختم ہوگی!)

ابو طالب نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بلا کر صورتِ حال بتائی اور آپؐ نے محسوس کیا شاید ابو طالب اب اُن کی حمایت سے دستکش ہونا چاہتے ہیں۔ تو آپؐ نے وہ تاریخی جواب دیا، جس جواب کی نظیر کسی مصلح یا انقلابی کے ہاں نہیں مل سکتی۔ آپؐ نے فرمایا کہ: "چاہے یہ لوگ میرے داہنے ہاتھ میں سورج اور میرے بائیں ہاتھ میں چاند لاکر رکھ دیں۔ مگر جب تک میری جان میں جان ہے، میں یہ کام بند نہیں کروں گا!"

تیسری بار ولید ابن مغیرہ اور مطعم ابن عدی جیسے بااثر لوگوں کا وفد آیا اور اس وفد کے ناکام لوٹنے کے بعد بالآخر وہی ہوا جو اس صورتِ حال کے نتیجے میں لازماً ہونا چاہئے تھا۔ یعنی کفار نے مسلمانوں کے خلاف تشدد اور طاقت استعمال کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

چنانچہ ہر قبیلے نے خود اپنے قبیلے کے ان افراد پر ظلم وستم ڈھانے شروع کردیئے جو مسلمان ہوگئے تھے۔ لیکن ابتداءً نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف کفار کو ابو طالب کی ہیبت کے باعث کوئی قدم اٹھانے کی جرأت نہ ہوئی، بلکہ ابولہب کو چھوڑ کر پورا ہاشمی قبیلہ ابو طالب کے اثر سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دیتا رہا۔

آنحضرتؐ کے ساتھ کفار کا برتاؤ لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر فقرے بازی، آپ کی تضحیک اور ہنسی اُڑانے کے ساتھ ساتھ آپؐ کو مختلف توہین آمیز ناموں سے پکارنے کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ معاشرہ کے ایک سنجیدہ اور باوقار انسان کے لئے یہ صورتِ حال بھی بے حد تکلیف دہ تھی۔ چنانچہ آپؐ کی تسلی کے لئے اللہ تعالیٰ نے بشارت دی کہ ان مذاق اڑانے والوں سے ہم نمٹ لیں گے۔ اِنَّا كَفَيْنَاكَ الْمُسْتَهْزِئِيْنَ ۝ (بے شک ہم اے نبی! ان مذاق اڑانے والوں کی تمھاری طرف سے خبر لینے کے لئے کافی ہیں۔

آزمائش کی بھٹی میں سونے کا نکھار یہ دور مسلمانوں کی شدید آزمائش کا دور تھا۔ اس آزمائش کے باعث ان کے ایمان میں پختگی اور ان کے عمل میں اخلاص پیدا ہوا، اور سب سے بڑھ کر یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ سے اُن کا تعلق مضبوط ہوتا

چلا گیا۔ نیز نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کی محبت میں اضافہ ہوتا رہا۔ کیونکہ ایک طرف آپؐ خود ان مصائب کو برداشت کر رہے تھے۔ دوسری طرف ایک ایک مسلمان کے زخموں پر اپنی شفقت اور محبت کا مرہم رکھ رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو ہدایت کی تھی: وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ: "مومنوں کو (اپنے رحمت و شفقت کے) پروں میں سمیٹ لو"

چنانچہ آپؐ ایک ایک مظلوم کو تسلی دیتے، اُس کے آنسو پونچھتے اور دنیا میں کامیابی اور آخرت میں جنت کی بشارتیں دیتے تھے، لیکن ابھی آزمائش کا اس سے بھی بڑا مرحلہ آنے والا تھا، جب کفار خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی نشانہ تشدد بنانے پر تل گئے۔ اس مرحلے کی تفصیل اِنْ شاء اللہ العزیز آئندہ قسط میں پیش کی جائے گی ۞ وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

(۴)

ظلم و تشدد کا دوسرا مرحلہ

مکہ معظمہ میں جب مسلمانوں پر تشدد دوسرے مرحلے میں داخل ہوا اور کفار نے خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ظلم و تشدد کا نشانہ بنانا چاہا۔ بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس دھمکی کے مطابق جو انہوں نے ابو طالب کو دی تھی، نعوذ باللہ قتل کرنے تک آمادہ ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے سورۂ مومن اور سورۂ زمر وغیرہ سورتیں نازل فرمائیں ۞

قرآن کی بشارت ظلم و تشدد کے طوفان میں | ان سورتوں میں مختلف پیرایوں کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو، اور درحقیقت آپ کے واسطے سے مسلمانوں کو یقین دلایا گیا کہ کفار خواہ کتنی ہی چلت پھرت دکھا لیں، لیکن وہ تمہارا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے۔ اس سے پہلے جب بھی کسی قوم نے اپنے رسول پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت کی تو وہ خود اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ہلاک کر دی گئی ۞

سورۂ مومن میں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے ارشادِ باری تعالیٰ ہوا:

مَا يُجَادِلُ فِيْ اٰيٰتِ اللّٰهِ اِلَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَلَا يَغْرُرْكَ تَقَلُّبُهُمْ فِي الْبِلَادِ ۝ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّالْاَحْزَابُ مِنْۢ بَعْدِهِمْ وَهَمَّتْ كُلُّ اُمَّةٍۢ بِرَسُوْلِهِمْ لِيَاْخُذُوْهُ وَجٰدَلُوْا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ فَاَخَذْتُهُمْ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ ۝

(اللہ تعالیٰ کی آیات کے بارے میں تو وہی لوگ جھگڑا کرتے ہیں جن کی عقلوں پر کفر کا پردہ پڑ گیا ہے۔ لہٰذا شہروں میں اُن کی چلت پھرت سے تم دھوکا نہ کھاؤ (یہ کچھ بھی نہ کر سکیں گے) اُن سے پہلے نوحؑ کی قوم نے بھی جھٹلایا تھا اور نوحؑ کی قوم کے بعد دوسرے گروہوں نے بھی (جھٹلایا تھا) اور ہر قوم نے اپنے رسول کو بُرے ارادے کے ساتھ پکڑنا چاہا تھا اور باطل کو لے کر حق کو گرانا چاہا تھا، تو میں نے ان سب کو پکڑا پھر دیکھو میری سزا کیسی تھی!!)

اسی سورت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل اور فرعون کے واقعہ کے مختلف پہلوؤں کو واضح کر کے بتایا گیا کہ فرعون اپنی ساری قوت و طاقت کے باوجود حضرت موسیٰؑ اور بنی اسرائیل کا کچھ نہ بگاڑ سکا۔ بلکہ اس کی ساری تدابیر خود اسی کی ہلاکت کا سبب بنیں تو پھر یہ کفارِ مکہ تم کو کیا نقصان پہنچا سکیں گے۔

رزمِ حق و باطل میں مومن کی فولادی سیرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اور تمام اہلِ ایمان کو سکھایا گیا کہ وہ ان ظالموں کے سامنے نہ جھکیں نہ دبیں، نہ نرمی اور مداہنت برتیں۔ بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح نہایت تیکھے انداز سے کہہ دیں: اِنِّيْ عُذْتُ بِرَبِّيْ وَرَبِّكُمْ مِّنْ كُلِّ مُتَكَبِّرٍ لَّا يُؤْمِنُ بِيَوْمِ الْحِسَابِ (میں اپنے اور تم سب کے ربّ کی پناہ میں آ گیا، ہر اُس متکبّر کے مقابلے میں جو روزِ حساب پر ایمان نہیں رکھتا!)

پھر آگے چل کر نہایت پُرزور انداز میں بتایا کہ اللہ تعالیٰ کی نصرت و تائید اپنے رسولوں کے ساتھ ہوتی ہے۔ اِس لئے اُن پر کوئی شخص گزند نہیں پہنچا سکتا:۔

اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ۔ (یقیناً ہم اپنے رسولوں کی اور ایمان لانے والوں کی دنیا

ملیں بھی مدد کریں گے اور اُس دن بھی مدد کریں گے جب (ان مجرمین کے خلاف یہ مومن) گواہ بن کر کھڑے ہوں گے!)

آنحضرتؐ کی حفاظت کیلئے اہل ایمان کو ہدایت | سورۂ مومن میں مسلمانوں کو نہایت لطیف انداز میں یہ بات بھی سمجھائی گئی کہ کفار اگر حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کسی وقت دست درازی کی گستاخی کریں تو ہر مومن کا فرض ہے کہ وہ آگے بڑھ کر آپ کو بچانے کی کوشش کرے اور کفار کے تشدّد کا رُخ اپنی طرف پھیر لے۔ یہ ہدایت آلِ فرعون میں سے ایمان لانے والے ایک شخص کے واقعہ کو بیان کرکے دی گئی ہے کہ جب فرعون نے غصّہ میں آکر فیصلہ کر لیا کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السّلام کو نعوذ باللہ قتل کر دے گا، تو فرعون کے اہل دربار میں ایک شخص جو ایمان لا چکا تھا، مگر جس نے اب تک ایمان لانے کا اظہار نہ کیا تھا، یکایک اٹھا اور کہا:

اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ ط

(کیا تم ایک آدمی کو محض اس بات پر قتل کرو گے کہ وہ اللہ کو اپنا ربّ مانتا ہے)

اس طرح فرعون کے غصّہ کو اُس شخص نے اپنی طرف پھیر لیا اور خود فرعون اس شک میں پڑ گیا کہ میرے دربار میں ابھی اور معلوم نہیں کتنے لوگ اسی شخص کی طرح حضرت موسیٰ علیہ السّلام کے پیرو بن چکے ہوں گے — اسی واقعہ کی رہنمائی پر عمل کرتے ہوئے ایک بار سیّدنا ابوبکر صدّیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے انہی الفاظ کو دُہرا کر کفّار کا غصّہ اپنی جانب پھیر لیا تھا۔ جب عُقبہ ابن معیط کی سرکردگی میں وہ لوگ حرم کے اندر حضور صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کو نعوذ باللہ قتل کرنے پر تل گئے تھے اور عقبہ ابن ابی معیط حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی گردن میں ایک چادر ڈال کر اسے بل دینے لگا تھا۔ اِس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سب کفّار آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کو چھوڑ کر حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر پل پڑے اور اُن کو اتنا مارا کہ لوگوں نے یقین کر لیا کہ یہ اب زندہ نہ بچیں گے۔ پورا چہرہ اتنا متورّم ہو گیا تھا کہ مُنہ اور ناک کا پتہ چلانا دشوار تھا۔

کفّار کے مقابلے میں اہلِ ایمان کا کردار | آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم اور آپ کے ساتھ تمام اہلِ ایمان نے اللہ تعالیٰ کی ہدایت پر سختی کے ساتھ عمل کیا

اور ہر موقعہ پر کفّار کو ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ایک بار کفّار کا ایک ٹولہ حرم میں بیٹھا ہوا آنحضرت کے خلاف اپنے جلے دل کے پھپھولے پھوڑ رہا تھا کہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم خانۂ کعبہ کا طواف کرنے پہنچ گئے۔ ان بدبختوں نے طواف کے پہلے چکّر، پھر دوسرے چکّر اور پھر تیسرے چکّر میں حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم پر آوازے کسے۔ تیسری بار آپؐ ٹھہر گئے، اور آپ نے اُن کو مخاطب کر کے کہا: "قریش والو! سُنتے ہو!! میں ذبح کے احکام لے کر آیا ہوں!" — یہ سننا تھا کہ سب کافروں کی سٹی گم ہو گئی اور سب بڑھ بڑھ کر حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی خوشامد درآمد کرنے لگے تاکہ آپؐ کا غصّہ ٹھنڈا ہو جائے۔ اِسی طرح ایک دوسرے موقعہ پر کُفّار نے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے وہ الفاظ نقل کر کے، جو آپ بتوں کے بارے میں کہتے تھے، نہایت سختی سے پوچھا کہ ہمارے معبودوں کے بارے میں کیا تم یہ یہ الفاظ کہتے ہو؟ آنحضرتؐ نے نہایت لاپرواہی سے جواب دیا: "ہاں یہ سب باتیں مَیں ہی کہتا ہوں!"

ہجرت کا آغاز پھر جب ظلم و ستم حد سے گزر گیا تو اہلِ ایمان کو ہجرت کا اشارہ ملا: "قُلْ يٰعِبَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۭ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ۭ وَاَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةٌ ۭ اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝" (اے نبی! میری طرف سے) کہہ دو کہ اے میرے ایمان لانے والے بندو! اپنے ربّ سے ڈرو۔ تم میں سے جو لوگ خوبی کے ساتھ کام کریں گے، اُن کیلئے دنیا میں بھی بھلائی ہے (یہاں کی سرزمین اگر تمہارے لئے تنگ کر دی گئی ہے تو کوئی بات نہیں) بے شک میری سرزمین تو بہت کشادہ ہے۔ یہ صرف صبر کرنے والے ہی تو ہیں جن کو اُن کا اجر بے حساب دیا جائے گا!"

ہجرتِ حبشہ اِس کے بعد مسلمانوں کو جن پر ناقابلِ برداشت ظلم و ستم ہو رہا تھا حبشہ کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت ملی۔ یہ ہجرت ایک طرف ہجرت کرنے والوں کے لئے بڑی آزمائش تھی کہ وہ دین کی خاطر اپنے گھر بار کو چھوڑ سکتے ہیں یا نہیں، دوسری طرف یہ ہجرت معاشرہ کے اُن افراد کے ضمیروں کو جھنجھوڑنے کا ذریعہ بھی بنی، جن کے ضمیر میں انسانیت کی کوئی رمق بھی باقی تھی، کہ یہ بے سہارا لوگ محض اپنے عقیدے کو بچانے کے لئے ترکِ وطن پر مجبور کر دیئے گئے ہیں۔ تیسری طرف اس ہجرت سے نبی

صلّی اللہ علیہ وسلّم کی وہ دعوت جو پہلے تین برسوں میں مقامی دعوت تھی، اور جو تشدّد کے بعد پورے عرب میں پھیل گئی تھی۔ اب عالمی دعوت ہونے کی سرحد کو چھونے لگی لیکن نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم کو ابھی مکّہ چھوڑنے کی اجازت نہ تھی۔ کیونکہ آپ کو مصائب و مشکلات میں کام کرتے چلے جانے کے لئے کامل و مکمّل نمونہ پیش کرنا تھا۔ اور پھر آپ مومنوں کے لئے وہ ظاہری سہارا بھی تھے جو مصائب کے ہجوم میں ان کو تسلّی اور اطمینان سے آشنا کرتا تھا۔

علاوہ ازیں ابھی مکّہ کا جاہلی معاشرہ صالح افراد سے بالکلیّہ خالی نہیں ہوا تھا۔ بلکہ ابھی اس چھاچھ کو بلو کر اس میں سے بہت سا مکّھن نکالنا باقی تھا۔ چنانچہ ہجرتِ حبشہ کے بعد ابوجہل نے حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ساتھ جو گستاخی کی اس سے بھیر کر حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ مسلمان ہوئے۔ اسی طرح اپنی بہن، اور بہنوئی کے ثباتِ ایمان کو دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دل میں ایمان نے گھر کیا۔ لہٰذا حضورِ اکرم کا اس وقت ہجرت کر جانا بہت قبل از وقت ہوتا۔

وَ اٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○

بقیّہ عرض احوال از صٓ

اس وقت کے کچھ لوگوں کا خیال تھا، اور جیسا کہ آج بھی بعض استشراق زدہ خیال کرتے ہیں، تو اس انقطاع کی کبھی نوبت نہ آتی، نہ آپ کو پریشان ہونا پڑتا، اور نہ دشمنوں کے طعنے سننے پڑتے۔ اسی طرح انہوں نے قرآن مجید ہی کے حوالے سے مسلمانوں کو تنبیہ کی ہے کہ وہ دین کے متعلق اس خوش فہمی میں مبتلا نہ ہوں کہ یہ دین چونکہ اللہ کا اپنا دین ہے، اس لئے بغیر ان کے ہاتھ پاؤں ہلائے، خود بخود غالب و سربلند ہو جائے گا، ہرگز نہیں۔ سنّتِ الٰہی یہی ہے کہ دُنیاوی مقاصد کی طرح دین کی سربلندی بھی جِدّ و جُہد کے بغیر ناممکن ہے۔ جب اللہ کے رسول (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کو اس کے لئے محنت اور سخت مجاہدہ کرنا پڑا تو اُمّت کے لئے بھی دین کو سربلند کرنے کا یہی واحد راستہ ہے۔ انہوں نے آزمائش کے وہ تمام مراحل بھی قرآن کے حوالے سے پیش کئے ہیں جن سے حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم اور آپ کے ساتھیوں کو گذرنا پڑا۔ (بقیہ پر صٓ ۶۲)

روزہ اور اس کے آداب

محمد یونس جنجوعہ ایم اے، ایم ایڈ۔ جنڈیالہ شیر خان (شیخوپورہ)

روزہ اسلام کے پانچ بنیادی ارکان میں سے ایک ہے۔ روزہ ایک ماہ کا تربیتی پروگرام ہے۔ جو شخص اس ماہ مبارک کو کامل پرہیز اور پابندی کے ساتھ گزارے خدا اُسے حقیقی انعامات سے نوازتا ہے۔ روزہ اصطلاح میں اس عبادت کا نام ہے جس میں صبح صادق سے غروبِ آفتاب تک کھانے پینے اور مباشرت سے کُلّی اجتناب کیا جاتا ہے۔ روزہ دوسری اسلامی عبادات سے ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ یہ کہ دوسری عبادات میں دکھلاوا یا ریاکاری کا امکان ہو سکتا ہے۔ لیکن روزہ ریاکاری سے خالی اور یکسر خلوص پر مبنی ہوتا ہے۔ روزہ دار روزہ ظاہر کر کے چھپ کر کھانے پینے کا اختیار رکھتا ہے لیکن محض اللہ کی رضا کے لئے بھوک اور پیاس برداشت کرتا ہے۔ اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: انسان کے ہر عمل کا ثواب زیادہ کیا جاتا ہے۔ اس طرح کہ ایک نیکی کا ثواب دس گُنا سے سات سو گُنا تک پہنچ جاتا ہے مگر اللہ تعالیٰ نے فرمایا روزہ اس سے مستثنیٰ ہے۔ کیونکہ روزہ میرے ہی لئے ہے اور میں ہی اُس کی جزا دوں گا ..... الخ

رمضان شریف کو سال کے دیگر مہینوں میں امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ اس میں قرآنِ پاک کا نزول ہوا۔ اسی ماہ کو روزوں کی عبادت کے لئے مخصوص کیا گیا۔ اسی ماہ میں نیکی کو بڑھایا جاتا ہے۔ نفل ادا کرنے والے کو فرض ادا کرنے کے برابر ثواب ملتا ہے۔ رمضان شریف کی آمد پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کا خصوصی استقبال کرتے اور صحابہ کرامؓ کو فضیلتِ رمضان پر خطبہ دیتے۔ ایک دفعہ آپؐ نے فرمایا: "رمضان کا مہینہ آگیا ہے جو بڑی برکت والا ہے۔ حق تعالیٰ اس میں تمھاری طرف متوجہ ہوتے ہیں اور اپنی خاص

رحمت نازل فرماتے ہیں۔ تمھارے تنافس (نیکی کرنے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش) کو دیکھتے ہیں اور ملائکہ سے فخر کرتے ہیں۔ پس اللہ کو اپنی نیکی دکھلاؤ۔ بدنصیب ہے وہ شخص جو اس مہینہ میں بھی اللہ کی رحمت سے محروم ہوجائے!"

روزہ اللہ تعالیٰ کو اس قدر پسند ہے کہ سابقہ امتوں پر بھی یہ فرض تھا۔ یہ انسانی زندگی کو راہِ راست پر لانے اور خالقِ حقیقی کے احکام کی بجاآوری کا جذبہ پیدا کرنے کی تاثیر رکھتا ہے۔ جب کوئی شخص پورا مہینہ دن کو روزہ کی حالت میں گزارتا ہے، اور رات کو خدا کے حضور سجدہ ریز ہوتا ہے۔ تو اُسے معرفتِ الٰہی اور خوفِ خدا کی نعمت میسّر آتی ہے، تقویٰ کی دولت ملتی ہے اور اس کی زندگی قابلِ رشک حد تک سنور جاتی ہے۔ جس نے مہینہ بھر اللہ کی خوشنودی کے لئے حلال اور جائز چیزوں سے اجتناب اختیار کیا۔ وہ رمضان کے بعد جہاں حلال اور جائز اشیاء سے انتفاع کرے گا۔ وہاں حرام اور ناجائز چیزوں سے ضرور دُور رہے گا، اور یہی روزہ کا مقصد ہے بقولِ الفاظِ حدیث: "جس نے رمضان کے روزے ایمان اور احتساب کے ساتھ رکھے اُس کے تمام پچھلے گناہ معاف کر دیئے گئے!"

مگر آج کل دیکھنے میں آتا ہے کہ بہت سے مسلمان روزہ نہیں رکھتے اور جو رکھتے ہیں، اُن کی زندگی بھی مندرجہ بالا نتائج سے عاری نظر آتی ہے۔ اوّل الذکر گروہ تو حدیثِ محوّلہ بالا کے مطابق بدنصیب اور قدرناشناس ہے۔ وہ خدا کی رحمت میں گھرے ہوئے ہونے کے باوجود رحمت حاصل کرنے سے غافل ہے۔ وہ اپنی زندگی اس طرح گزار رہا ہے کہ روزِ محشر اُسے خود اپنے اوپر افسوس آئے گا۔ مگر اُس وقت کا پچھتانا اُس کے کسی کام نہیں آسکے گا۔ البتہ جو روزے دار ایسے ہیں کہ اُن کا روزہ اُن کی زندگی پر خوشگوار اثرات مرتّب نہیں کرتا۔ انہیں اپنی اس عبادت میں ہونے والی خامیوں کو دُور کرنے کی کوشش کرنا چاہیئے۔ روزے کی حالت میں جہاں وہ کھانے پینے سے پرہیز کرتے ہیں، وہاں جسم کے دوسرے اعضاء کو بھی کنٹرول میں رکھیں۔

غیبت، جھوٹ، گالی گلوچ سے باز رہیں، چوری نہ کریں، دھوکہ نہ دیں۔ اس طرح اُن کا روزہ صحیح معنوں میں روزہ ہوگا، جو انہیں تقویٰ شعار بناکر پسندیدہ انسان بنا دے گا۔ ورنہ اُن کا روزہ فقط فاقہ کشی اور رات کی عبادت خواہ مخواہ کا جاگنا ہوگا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "بہت سے روزہ دار ایسے ہیں کہ روزے سے بھوک اور پیاس کے سوا اُن کے پلّے کچھ نہیں پڑتا اور بہت سے راتوں کو کھڑے رہنے والے ایسے ہیں کہ انہیں بیداری (کی مشقت) کے سوا نہیں ملتا!"

نیز آپؐ نے فرمایا: "جس شخص نے جھوٹ بولنا اور برا کام کرنا نہ چھوڑا پس خدا کو اس کے کھانا پینا چھوڑنے کی حاجت نہیں!" — اسی طرح آپؐ نے فرمایا: "روزہ (آدمی کیلئے) ڈھال ہے۔ جب تک اُسے پھاڑ نہ ڈالے!" — پوچھا گیا، حضرت! روزہ کس چیز سے پھٹ جاتا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: "جھوٹ اور غیبت سے!"

اللہ تعالیٰ ہم سب مسلمانوں کو توفیق دے کہ ہم ایمان اور احتساب کے ساتھ روزہ رکھیں۔ اس طرح رمضان المبارک ہمارے گناہوں کی بخشش کا سبب بن جائے۔ آمین ثم آمین ؎

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ o

بقیہ عرض احوال از ص ۵۹

ماہِ رمضان المبارک کو گذرے ایک مہینہ ہو چکا ہے۔ اس لئے "روزہ اور اس کے آداب!" نامی مضمون شاید بعد از وقت خیال کیا جائے۔ لیکن ایک تو یہ مضمون ہمیں موصول بھی دیر سے ہوا، دوسرے اس خیال سے کہ دین کی باتیں جاننے کے لئے کسی موسم (SEASON) کی ضرورت نہیں، محمد یونس صاحب جنجوعہ کا یہ مضمون شاملِ اشاعت کیا جا رہا ہے۔ امید ہے قارئین 'میثاق' کے لئے اِفادیّت کا حامل ثابت ہوگا۔

کراچی اور تحریکِ دعوت رجوع اِلیٰ القرآن

الحمد للہ والمنّۃ! کراچی میں مرکزی انجمن خدّام القرآن کے کراچی آفس کمرہ ۲۴۴ سٹی پلازا (پہلی منزل) مولانا حسرت موہانی روڈ میں پابندی کے ساتھ ہر جمعہ کو دس بجے صبح تا ۱۲ بجے دن ایک ہفتہ وار اجتماع منعقد ہوتا ہے جس میں جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے دُروس قرآنِ حکیم بذریعہ ٹیپ سنائے جاتے ہیں۔ بعدہٗ جناب مولانا عبد الرحمٰن صاحب سلفی (نومسلم) درسِ حدیث دیتے ہیں۔ گاہ گاہ تاریخ و سیرِ اسلامی سے متعلق کتب کا بھی مطالعہ ہوتا ہے۔ کراچی کے قارئین 'میثاق' سے اس اجتماع میں شرکت کی خصوصی درخواست ہے۔ کراچی آفس کا تفصیلی پتہ مندرجہ ذیل ہے:

پاکستان چوک سے اوٹرم روڈ کے آخر میں حقانی چوک واقع ہے جہاں سے بائیں طرف چندریگر روڈ جانے کے لئے سڑک مڑتی ہے۔ اس سڑک پر اپنے ہاتھ نگار ہوٹل کی عمارت آتی ہے، جو فی الحال زیرِ تعمیر ہے۔ اس کے بعد سرکاری کانٹا آتا ہے، جہاں پر ٹرکوں کا وزن ہوتا ہے۔ اس کانٹے سے داہنی طرف سے مولانا حسرت موہانی روڈ شروع ہو جاتی ہے، جس کی داہنی طرف پہلی بلڈنگ چھوڑ کر نیا تعمیر شدہ سٹی پلازا واقع ہے۔ چندریگر روڈ کی جانب سے آنے والے حضرات میسرز فیروز سنز کے آفس سے جب حقانی چوک کی طرف رخ کریں گے تو مولانا حسرت موہانی روڈ اُن کے بائیں سمت آئے گی۔

اس اجتماع میں شرکت کی عام دعوت ہے۔ قارئینِ 'میثاق' مقیم کراچی سے درخواست ہے کہ خود بھی شرکت فرمائیے اور اپنے حلقۂ احباب کو بھی شرکت کی دعوت دے کر تعاون فرمائیے۔ جزاکم اللہ خیراً! کراچی آفس جمعہ کے علاوہ عصر تا مغرب کھلا رہتا ہے اور مرکزی انجمن کی تمام مطبوعات بھی دستیاب ہیں۔

الدّاعی: اعزازی ناظم دفتر کراچی آفس مرکزی انجمن خدّام القرآن

تصانیف :- ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم

اسلامی تحقیق کا مفہوم ، مدعا اور طریق کار قسم اعلیٰ ۸/ قسم ادنیٰ ہدیہ /۱ روپے

تصانیف : ڈاکٹر اسرار احمد

ــــ اسلام کی نشاۃ ثانیہ : کرنے کا اصل کام	ہدیہ -/۱ روپے
ــــ مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق (اُردو)	" -/۲ "
ــــ " " " (انگریزی)	" -/۳ "
ــــ " " " (عربی)	" -/۴ "
ــــ عظمت صوم	" -/۱ "
ــــ علامہ اقبال اور ہم	" ۱/۵۰ "
ــــ راہ نجات : سورۃ والعصر کی روشنی میں	" -/۲ "
ــــ قرآن اور امن عالم	" ۷۵/- "
ــــ دعوت الی اللہ	" -/۱ "
ــــ آیۃ الکرسی : ایک تشریحی تقریر	" ۳۰/- "
ــــ درس قرآن حکیم کا منتخب نصاب حصہ اول و دوم فی جزء	" -/۵ "
ــــ حج اور عید الاضحیٰ اور ان کی اصل رُوح	زیر طبع
ــــ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا مقصد بعثت	ہدیہ -/۳ روپے
ــــ قرآن حکیم کی سورتوں کے مضامین کا اجمالی تجزیہ (الفاتحہ تا الکہف)	" -/۳ "

تالیف : پروفیسر یوسف سلیم چشتی

اسلامی تصوف میں غیر اسلامی نظریات کی آمیزش ہدیہ -/۵ روپے

تالیف :- سید غلام احمد رضوی ایڈووکیٹ

یتیم پوتے کا حق وراثت ہدیہ -/۵ روپے

Regd.L. No. 7360

MONTHLY MEESAQ LAHORE

Vol. 28 | November 1979 | No. 11

احباب کے شدید تقاضے پر

سیرت و تاریخ کے موضوع پر

ڈاکٹر اسرار احمد

صدر مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور و امیر تنظیم اسلامی ، کی

۱۰ تقاریر کے TAPES

C-90 کے گیارہ CASSETTES کے SETS کی صورت میں تیار کرا لیے گئے ہیں -

جن کی بڑی تعداد پیشگی قیمت جمع کرانے والے حضرات کو دی جا چکی ہے اور اب صرف ایک محدود تعداد دستیاب ہے -

ہر سیٹ کی قیمت صرف لاگت کے مطابق -/۲۷۵ روپے ہے بذریعہ ڈاک منگانے والوں کو پانچ روپے محصول ڈاک خرچ کرنا ہوگا -

منگانے کا پتہ

ناظم اعلیٰ ، مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶ - کے ، ماڈل ٹاؤن ، لاہور

(فون : 852683 - 852611)

پرنٹر : چوہدری رشید احمد — مطبع : مکتبہ جدید پریس شارع فاطمہ جناح لاہور